ستمبر ۲۰۰۴ء

ماہنامہ

شعاع عمل

لکھنؤ

قَالَ اللّٰہُ تبارَکَ وَ تعالٰی

قَدْ جاءَکُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَ کِتابٌ مُبِیْنٌ

بیشک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور روشن کتاب

موسسۂ نور ہدایت حسینیۂ غفران مآبؒ لکھنؤ۔۳

Monthly

SHUA-E-AMAL

Lucknow

शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका

लखनऊ

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab, Chowk
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

ستمبر ۲۰۰۴ء

سخنان

دل و دماغ کو اپنی شعاعوں سے منور کرنے والا ماہنامہ جن دنوں سے علاقہ رکھتا ہے ان میں ۱۳؍رجب ہے جس دن امیر المومنین، امام المتقین، یعسوب الدین، غالب کل غالب، مطلوب کل طالب حضرت علی ابن ابی طالب علیہما الصلوٰۃ والسلام کی عید میلاد ہے۔ ۲۴؍رجب فتح خیبر کا دن ہے، ۲۵؍رجب کو امام سابع حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی، ۲۶؍رجب کو محسن اسلام و مربیٔ رسول اسلام حضرت ابوطالب علیہ السلام نے رحلت فرمائی، ۲۷؍رجب کو سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے اور آج ہی کی شب مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی، ۲۸؍رجب کو امام سوم سید الشہداء علیہ التحیۃ والثناء نے تحفظ قرآن و اسلام اور رسول مقبول کی امت کی اصلاح کے لئے اپنے محبوب و مالوف وطن کو خیر باد کہا اور ۳؍شعبان المعظم کو آپ ہی یعنی محسن انسانیت فرزند رسول الکونین امام المشرقین جگر پارۂ زہراؑ قرۃ العینین علی حضرت حسین سید الشہداء ارواحنا لہ الفداء کے جشن ولادت باسعادت کا روز ایمان افروز ہے۔

مذکورہ ذوات مقدسہ کو ہمیں زبان سے نہیں عمل سے خراج عقیدت اس طرح پیش کرنا ہے کہ حالات ہمیں نہ بدل سکیں بلکہ ہم حالات کو بدل دیں۔ اللہ کا رسول اور معصومین علیہم السلام کی اطاعت کرتے ہوئے تحفظ و ترویج اسلام کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار رہیں اور ترقی قوم و اصلاح معاشرہ کے لئے سعی پیہم جاری رکھیں۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے بانی قدوۃ العلماء مولانا آقا حسن صاحب قبلہ اور ان کی تحریک دینداری و بیداری

''صحیفۃ الملت'' معروف بہ لخت جگر (مصنفہ لسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی) میں ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنائے شیعہ کانفرنس کے تحت صفحہ ۷ تا ۱۰ پر تحریر ہے کہ ''شیعوں کے خیالات میں بھی کسی حد تک آزادی کی لہر دوڑ چکی تھی اور علماء بھی رفتار زمانہ کو نہایت صبر و تحمل سے دیکھ رہے تھے اور یہ خیال پیدا ہو ہی گیا کہ ضرورت زمانہ کے موافق شیعوں کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ مولانا سید آقا حسن قبلہ مجتہد لکھنؤ ایک خاص دل و دماغ اور مزاج زمانہ کے بہترین نبض شناس عالم تھے انہوں نے شیعوں کی دینی اور دنیاوی ترقی کو ملحوظ رکھ کر ۱۳۱۹ھ میں انجمن صدر الصدور کی بنیاد ڈالی، اس کے صدر عماد العلماء جناب سید مصطفی عرف میر آغا صاحب قبلہ (مرحوم) مجتہد اور متولی شمس العلماء مولانا جناب سید محمد حسین عرف علن صاحب قبلہ مجتہد اور (منصرم) سکریٹری مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ مجتہد اور نائب منصرم جناب مولوی سید علی غضنفر صاحب مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں اس کی مخالفت محسن الملک سید مہدی علی خانصاحب، بدر الدین طیب جی جسٹس بمبئی سر آغا خان صاحب اور میر سید حسین صاحب بلگرامی جیسی مقتدر ہستیوں نے کی مگر یہ انجمن اپنا کام کرتی رہی اور اس کی بڑی غرض یہ تھی کہ آزاد خیالی کو بڑھنے نہ دے اس انجمن نے ایک خاص عربی مدرسے کی بنیاد لکھنؤ میں ڈالی اور پیشماز و واعظین کا تقرر اس کی جانب سے ہوا یہاں تک کہ ۱۳۲۲ھ میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے لگا اس وقت بذریعۂ تحریرات وفتاویٰ علماء نے اعلان کیا کہ جب تک علی گڈھ میں تعلیم دینی کا پورا بندوبست شریعت کے موافق نہ ہو جائے علیگڈھ کالج میں کسی شیعہ کو روپیہ نہ دینا چاہئے اس پر اخبارات نے علماء کے خلاف سخت سے سخت مضامین لکھے۔ زمانے نے خیالات میں کچھ عجیب مدو جزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ قومی مفاد کے لئے یہ قرار پایا کہ انجمن صدر الصدور کے سالانہ جلسے لکھنؤ سے باہر کانفرنس کی صورت میں منعقد ہوا کریں۔ اس بارے میں اور ارکین

شیعہ اور خود حضرات علماء میں اختلاف پیدا ہوا بالآخر جدید و قدیم تعلیم یافتہ حضرات نے قومی مفاد کے لئے مل کر مدتوں غور کیا اس میں خصوصیت سے مرزا محمد ہادی صاحب رسوؔا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور خود مولانا آقا حسن صاحب قبلہ نے گہری دلچسپی لی اور ان لوگوں نے انجمن صدر الصدور کی صورت بدل کر مذاق زمانہ کے موافق ایک کانفرنس کی بنا ڈالنے کا تہیہ کیا اور اس کا ایک ڈھانچہ مرتب کیا ....اور پہلا جلسہ ۶/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو رفاہ عام کلب کی عمارت میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا اور اس میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی بناء پڑی اور انجمن صدر الصدور اسی میں فنا ہو کر معدوم ہوگئی یا یوں کہئے کہ وہ مشکل بہ صورت کانفرنس ہوگئی۔ یہ سب سے بڑی انجمن ہے جسے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کہتے ہیں.............. تمام ملک خصوصاً قریہ اور دیہات میں شیعہ مجتہدین کا کافی اثر تھا۔ انگریزی دانوں میں بیشتر حضرات کے قلوب کی چاہے جو حالت رہی ہو مگر بظاہر سب کے سب علماء پرست تھے۔ جدید اور قدیم تعلیم یافتہ حضرات ایک صورت میں نظر آتے تھے لیکن آزادی بڑھتی جارہی تھی۔ بعض بعض حضرات کے طرز عمل سے حضرات علماء اور بعض علماء کی بعض باتوں سے بعض تعلیم یافتہ حضرات کو شکایت پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ مجتہد نے سوچ کر جدید تعلیم یافتہ کو پرانے خیال والوں سے ملانے کی بہتر صورت یہ نکالی کہ انجمن کا اجلاس کانفرنس کی شکل میں ہو اور اس کی تشکیل اور تنظیم میں خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم نے پوری مدد دی۔ ابتداءً اس انجمن صدر الصدور (یا اسے شیعہ کانفرنس کہہ لیجئے) کے قواعد قریب قریب وہی تھے جو مولانا آقا حسن صاحب قبلہ نے مرتب کئے تھے۔''

قدوۃ العلماء اور شیعہ کالج

زبدۃ العلماء مولانا آغا مہدی صاحب مرحوم ''تاریخ لکھنؤ حصہ دوم صفحہ ۱۳۱ پر رقمطراز ہیں کہ ''حضرت قدوۃ العلماء وہ بلند ہستی ہے جس نے شیعوں میں بیداری کی لہر دوڑائی اور انجمن صدر الصدور کو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کیا........... دنیائے صحافت کو معلوم ہو کہ پہلا پرچہ ماہنامہ ''معالم'' انہوں نے نکالا، پہلا اخبار ''الناطق'' ان کے گھر سے نکلا۔ وہ عوام کے مجتہد تھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے لئے وقت ملاقات مقرر نہ تھا۔ ان کو کہیں جانے کے لئے سواری کی ضرورت نہ تھی۔.......... قدوۃ العلماء کی سادگی اور روحانیت اور خدمت خلق تن تنہا وہ مرکز تھی جس پر غیر مسلمین کو بھی ناز تھا۔''

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی ''تاریخ لکھنؤ حصہ اول'' کے صفحہ ۱۹۲ پر لکھتے ہیں کہ ''مولانا آقا حسن صاحب معقولات میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ قومی قیادت کی بھی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ انہوں نے شیعہ قوم کو ایک نئی زندگی بخشی، ان کا قومی پلیٹ فارم قائم کیا، شیعہ کانفرنس، شیعہ یتیم خانہ اور شیعہ کالج کی بنیاد ڈالی، اخبار اور پریس قائم کر کے بیداری کی لہر دوڑائی۔''

قدوۃ العلماء شیعہ کالج کی تحریک کے محرک و نگراں اور کالج کے لئے ایک بانی کی حیثیت رکھتے تھے۔ لسان الشعراء سید مجاور حسین تمنؔا مرحوم نے جو قطعۂ تاریخ تعمیر شیعہ کالج تصنیف فرمایا ہے جس سے اذہان کافی حد تک بنائے شیعہ کالج کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں، پیش لکھنؤ میں یہ عمارت بن گئی جس روز سے　قوم کی ہر فرد کے قلب و جگر کو چین ہے ہے۔

کام پورا کیوں نہ ہوتا سر پہ تھے آقا حسن　خدمت مخلوق جن کا خاص نصب العین ہے

جن کے اخلاص عمل نے قوم کو دی زندگی　ہر قدم جن کا ترقی کے لئے بے چین ہے

یہ تمنا عیسوی میں سال ہے تعمیر کا　شیعہ کالج روضہ ہائے شاہ کے مابین ہے

(ادارہ)

قرآن فہمی کے کچھ بنیادی اصول

عمادالعلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی مدظلہ

قرآن پاک کی ماہیت اور نوعیت

قرآن پاک کس قسم کی کتاب ہے؟ قرآن پاک کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی روحانی اہمیت کیا ہے؟ قرآن مجید کے حوالے سے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہمیں کس طرح اسکو اپنی زندگی میں ڈھالنا ہے؟ قرآن کریم کا محور، موضوع اور مرکزی خیال کیا ہے؟ وہ کس قسم کی دلیل و برہان اور انداز بیان اپناتا ہے؟ اگر ہم ان سوالات کا واضح اور غیر مبہم جواب حاصل کر سکے تو ہم قرآن فہمی کے سلسلے میں بعض خطرناک غلطیوں سے بچ سکتے ہیں اور قرآن پاک سے افرادی اور اجتماعی زندگی میں ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی ماہیت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا چاہئے:

۱۔ قرآن پاک خدا کا کلام اور بنی نوع انسان کے لئے خدا کی رحمت ہے۔ یہ عظیم روحانی توانائی کا حامل ہے۔ اس کے بارے میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے ''اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے ڈر سے دبا اور چکنا چور ہوتا جا رہا ہے۔ (سورہ ۵۹: آیت ۲۱)

قرآن کریم ہمارے پیغمبر حضرت محمدؐ کو خداوند کی طرف سے عطا کیا ہوا معجزہ ہے جس کا جواب لانے سے جن و انس عاجز ہیں اور جو موجودات کے لئے فیض ربانی کا بے نظیر وسیلہ ہے۔

''اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں'' (سورہ ۱۷ آیت ۸۸)

''اور اگر تمہیں اس بات میں شبہہ ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس جیسا ایک ہی سورہ بنا لاؤ اپنے خیال کے سارے ہی لوگوں کو بلا لو ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ (سورہ ۲ آیت ۲۳)

تین مرتبہ قرآن کریم میں یہ دعویٰ دہرایا گیا ہے کہ آخر کار قرآنی پیغام پوری کائنات پر غالب ہوجائے گا۔

قرآن کریم کا مطالعہ کسی عام کتاب کے طور پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کو کلام الٰہی اور فیض ربانی کا ذریعہ سمجھنا چاہئے۔ یہ خدائی ریسمان ہے جو انسان کی ہدایت کے لئے آسمان سے آویزاں کی گئی ہے۔ اگر قرآن کا ہم اس تواضع، فروتنی اور عقیدت کے ساتھ مطالعہ کریں تب ہی قرآن کے پوشیدہ گنجینوں تک رسائی ممکن ہے۔ اگر ہم قرآن مجید کا کسی عام کتاب کے طور پر مطالعہ کرنا چاہیں تو اس کی روح ہماری نظروں سے پنہاں ہوجائے گی اور ہم کو

الفاظ ظاہری کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ روحانیت کی یہ منطق ہے کہ جب تک مرشد کے سامنے سر تسلیم جھکایا نہ جائے اور انکساری تواضع، فروتنی، عقیدت وارادت کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوا جائے تب تک ہدایت کا فیض حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم سے بڑھ کر کون مرشد ہو سکتا ہے۔

قرآن آخری اور کامل ترین وحی الٰہی

ماہیت قرآن کے سلسلے میں دوسرا نقطہ جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم آخری کتاب آسمانی الٰہی وحی ہے قرآنی شریعت قیامت تک انسانی ہدایت کا سرچشمہ رہے گی ۔ قرآن کریم کی خاتمیت کا دارومدار اس کی کاملیت پر ہے۔ اس وقت تک نئی شریعتیں اور نئی وحی آتی رہی جب تک ضرورت رہی اور دین کامل نہیں ہوا تھا۔ نزول قرآن کے ساتھ تکمیل دین کا اعلان ہو گیا۔

۳۔ کتاب ہدایت ماہیت قرآن کے ادراک کے سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن بنیادی طور پر کتاب ہدایت ہے قرآن کا اصل مقصد ہدایت اور حقیقت کا ایک نیا شعور پیدا کرنا، فکری اور اعتقادی سانچوں کو تبدیل کرنا اور ایک نئے شعور اور نئی تحریک دعوت کا آغاز کرنا جو قرآن کریم انسانی فکر و عمل کے لئے ایک جنرل فریم ورک، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے جہت، طریق کار اور عمومی نقشہ فراہم کرتا ہے جس پر چل کر انسان سعادت دین و دنیا حاصل کرتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا بنیادی محور ہے اور اس کتاب مقدس میں جو کچھ آیا ہے وہ اسی مقصد کا تابع ہے۔

اگر قرآن کی یہ ماہیت پیش نظر رہے تو ہم قرآن کو صرف برکت کے لئے طاق پر رکھنے یا شفای امراض کے لئے ہوا دینے اور ایصال ثواب ارواح مردگان کے لئے ہی استعمال نہ کریں بلکہ اپنی عملی زندگی میں اس سے طلب گار ہدایت ہوں اور اپنے فکری سانچوں کی تعین اور اپنے عمل کی جہت دہی کے لئے قرآن کی طرف رجوع کریں۔

خود قرآن کریم جو عناوین اپنے لئے استعمال کرتا ہے وہ اس کی نوعیت کے اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قرآن انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رہنمائی کرتا ہے۔ ایک مسلمان کی پوری زندگی کا قرآنی تعلیمات کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کا ایک عنوان برہان ہے، برہان کا مفہوم دلیل روشن ہے۔ دوسرا نام البیان یعنی شرح حقائق ہے۔

ولایاتوک بمثل الاجئنک بالحق واحسن تفسیرا ہم حقیقت پیش کر دیتے ہیں اور زیادہ تشریح کی صورت میں۔

قرآن پاک کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان نکات کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو خود قرآن خدا، انسان اور خدائی ہدایت کے بارے میں بیان کرتا ہے:

''پروردگار عالم نے زمین پر انسان کو پیدا کیا۔ اسے عقل وفہم کی صلاحیت، خیر و شر کے درمیان تمیز کی لیاقت اور آزادی انتخاب کی خصوصیت سے آراستہ کیا۔ صرف اللہ ہی انسان کا پروردگار ہے۔ ساری دنیا اس کے قانون پر عمل پیرا ہے، لیکن انسان کو اختیار وارادے کی آزادی حاصل ہے اس لئے اسے خود اپنا راستہ تلاش کرنا ہے۔ انسان کو ارادے

کی آزادی سے نوازا گیا۔ اسے خیر وشر کے درمیان کسی ایک کو اختیار کرنا تھا۔ پروردگار رحمان مطلق ہے اس نے انسان کو اپنی رحمت کے بغیر سہارا اور مدد کے نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے انبیاء اور صالحین کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا۔ آدم پہلے پیغمبر تھے اور انہیں سے ہدایت کا عمل شروع ہوا پھر مختلف ملکوں اور زمانوں میں مختلف نبی بھیجے گئے۔ سب کے سب ایک ہی راہ ہدایت پر گامزن رہے اور اسی ہدایت کا پیغام بنی نوع بشر کو دیا۔

آخر میں پروردگار عالم نے حضرت محمدؐ کو بھیجا اور انسان کی ابدی ہدایت کے ذریعہ کے طور پر قرآن پاک نازل کیا۔ قرآن پاک تمام انسانوں اور تمام آنے والے ادوار کے لئے ایک آفاقی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، نہ ہی انبیاء کی کہانیوں کی کتاب ہے اور نہ ہی فقہ اور قانون کا کوئی مجموعہ اور نہ محض ادب پارہ ہے بلکہ ''کتاب ہدایت'' ہے۔ یہی قرآن کی بنیادی ماہیت اور نوعیت ہے۔ اس میں قصص انبیاء بھی ہیں، تاریخ اقوام بھی، احکام قانون بھی ہیں اور سائنسی حقائق بھی، ادبی عظمت بھی ہے اور حسن بیان بھی۔ اس میں یہ سب امور شامل ہیں لیکن صرف اس حد تک اور اس انداز تک جو مقصد کے لئے ضروری ہے۔ اس کو ذہن میں رکھے بغیر قرآن کریم کے درک معانی اور شرح مقاصد میں سخت غلطیاں ہوسکتی ہیں۔

قرآن کتاب تفصیلات نہیں کتاب کلیات ہے

قرآن کریم، جو قیامت تک کی ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے، جزئیات میں نہیں جاتا بلکہ کلی طور پر بنیادی اصول اور عام نقشہ اور طریق کار فراہم کرتا ہے۔ قرآن پاک وسیع وعریض عام اصول وضوابط کی کتاب ہے۔ اس کتاب کا خاص مقصد الہامی پروگرام کے اخلاقی اور فکری بنیادوں کو واضح اور مکمل طور پر پیش کرنا اور سمجھانا ہے۔ عملی اسلامی زندگی کے لئے اس کا طریق ہدایت اس بات پر مشتمل نہیں ہے کہ تفصیلی قاعدے قانون بیان کئے جائیں۔ وہ صرف بنیادی ڈھانچے کا خاکہ پیش کرتا ہے اور کبھی کبھی صرف علامتی انداز میں بنیادی حقائق کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔

جو لوگ قرآن پاک کا مطالعہ اس تصور کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ کتاب افلاطون وارسطو کے مقالے کی طرح منظم، منطقی یا فلسفیانہ بحث یا رومن قانون کی طرح تفصیلی کوڈ پر مشتمل ہوگی اور اقتصادی، سیاسی اور سماجی معاملات یا شکل و مراسم عبادت کے تفصیلی اصول وضوابط کی توقع رکھتے ہیں انہیں سخت مایوسی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک وحی اور فلسفیانہ تصنیف کے اسلوب میں وہ تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وحی علامتی تہ دار اظہار میں بنیادی ڈھانچہ، رہنما اور آفاقی سمت دیتی ہے۔ لیکن اس کا کام نہ تفصیلات بیان کرنا ہے نہ منظم رسالہ کی ترتیب ہے۔ اگر ہم عجز وانکساری کے ساتھ اس کے قریب آئیں تو ہمارے سارے مسائل کا حل اس میں مل جائے گا بشرطیکہ ہم اس کی علامتی تہوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ وحی ہمیشہ خدائی پیشواؤں کے ہمراہ رہتی ہے جو وحی کی توضیح وتشریح کرتے ہیں اور ان کی تفصیلی شکل پیش کر کے اس کے عام وسیع

اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

کتاب دعوت

ماہیت قرآن کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن 'دعوت' اور تحریک کی کتاب ہے۔ قرآن پاک کی ہر صورت درحقیقت گفتگو، تقریر کا ایک ٹکڑا ہے جو اسلامی تحریک کے کسی خاص مرحلے پر نازل ہوا۔ ہر وحی مخصوص قسم کے حالات کے تقاضے کے تحت نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ توجہ رہے کہ تحریک ہمیشہ سیاسی ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانیت کو راہ مستقیم کی طرف ہدایت کرنا بھی ایک وسیع روحانی تحریک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں نظام عدل وقسط کا قیام تحریک کا ایک اہم جزء ہے لیکن کل نہیں۔ یہ وضاحت اس وجہ سے ضروری ہے کہ تحریک کے لفظ سے اکثر سیاسی پہلو ہی کا تصور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کوئی فلسفیانہ ٹریٹیز یا قانونی مینوئل نہیں بلکہ تحریک کا راہنما ہے۔ قرآن کا اگر اس تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو اس کے درک اور اس کی روح تک پہنچنے میں سہولت ہوگی۔

آفاقی اور عمومی کتاب ہدایت

ماہیت قرآن کے سلسلے میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن پاک آفاقی ہدایت کا سرچشمہ ہے جو صرف عرب ہی نہیں بلکہ ساری قوموں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس کی تعلیمات کسی خاص خطہ، کسی خاص قوم یا کسی خاص اہل زبان کے لئے نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عام طور سے آیات میں عرب لوگ، ان میں بھی قریش، مہاجرین، انصار، یہود و نصاریٰ یثرب سے تخاطب ہے اور عرب کے مذاق، افتاد طبع ماحول، تاریخ، رسم و رواج اور محاورات و مکالمات کے حوالے سے بیان ہے۔ یہ وحی کا عام طرز ہے کہ عمومی تعلیمات، خصوصی پس منظر میں پیش کی جاتی ہیں۔ وحی ماحول کے ان اسماء اور واقعات کا استعمال کرتی ہے جس کے اندر وہ اتری ہے لیکن وہ آفاقی حقائق کی علامات ہیں اسی انداز سے ان کا مطالعہ کرنا چاہئے جس قوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے اس کی حیثیت ''کیس اسٹڈی''، یعنی خصوصی مطالعہ کی ہوتی ہے لیکن جو کہا جاتا ہے وہ تمام انسانوں سے تخاطب ہوتا ہے۔ یہ اسلوب بائبل اور تمام دوسری مقدس کتابوں میں بھی ملتا ہے جب کہ ان میں سے بعض کا تعلق کسی خاص قوم سے رہا ہے لیکن قرآن تو اعلانیہ طور پر ''عالمین'' کے لئے بھیجا گیا ہے عربوں سے تخاطب کے حقیقی سبب کو سمجھنے میں ناکامی ایک آدمی کو اس خیال پر آمادہ کرسکتی ہے کہ قرآن کریم کا نصب العین ایک مخصوص عہد کے عربوں کی اصلاح کرنا تھا۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی وحی کے خاص رمزی اسلوب کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک پیغمبر ایک فلسفی سے الگ ہوکر، محض تصوراتی انداز میں بات نہیں کرسکتا ہے۔ کوئی نظریہ یا مذہب تصورات پر مشتمل نہیں ہوتا ہے۔ دین اگر نرے تجریدی تصورات پر مبنی ہو تو اس میں اور فلسفہ میں کوئی فرق نہ ہوگا، وہ لائبریریوں تک محدود رہے گا اور قوموں کی کایا پلٹ نہیں کرسکتا، تاریخ کے دھارے کو نہیں موڑ سکتا اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرسکتا، نہ افراد کے اندر روحانی انقلاب لاسکتا ہے۔ ایک پیغمبر کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔ لیکن ان آفاقی تعلیمات کو ان

امور کے حوالے سے بیان کرتا ہے جن سے وہ لوگ جن کے بیچ میں وہ اصل میں آیا ہے واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کا پیغام صرف مخصوص لوگوں بالخصوص ایک عہد کے لئے ہی مناسب ہے۔ جس بات پر غور کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ کیا قرآنی بیانات جو اس عہد کے عربوں کے مشرکانہ عقائد کی تردید میں ہیں وہ دنیا کے دوسرے حصوں میں شرک کی دوسری شکلوں پر بھی منطبق ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیا دلیل و برہان کا قرآنی انداز ہر عہد کے لئے کارآمد اور موٴثر ہے؟ اور جواب مثبت ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کی آفاقی تعلیم کو مخصوص لوگوں کے لئے خاص کر دیا جائے۔

ابدی کتاب ہدایت

اس سے زیادہ قطعی اور فیصلہ کن تصور یہ ہے کہ قرآن پاک صرف دور پیغمبرؐ کے لئے ہی نہیں بلکہ ابدی ہدایت کا ایک ذریعہ ہے جو ہر زمانے کے لئے یکساں قابل عمل ہے اور خصوصاً ہمارے عہد حاضر کے لئے نہایت واضح رہنما ہے۔ لیکن جو کچھ قرآن کریم کی عمومیت کے بارے میں کہا گیا وہ یہاں بھی صادق آتا ہے۔ کتاب وحی میں ایک مخصوص عہد کی شخصیتوں، قبائل، واقعات، رسم و رواج و محاورات کے حوالے ہوتے ہیں لیکن ان کا مصداق ہر دور کے انسان ہوا کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو قرآن ابدی کتاب ہدایت کیسے ہو سکتا ہے؟ کسی خاص دور کے حوالوں کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور ایک علامتی حیثیت بھی ہے۔ ابولہب یا فرعون وہ اشخاص بھی ہیں جو کسی خاص دور میں تھے اور ایک علامت بھی ہیں جو ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ جس پیغام کو لوگوں تک پہونچایا گیا ہے وہ ہر زمانہ کے لئے ہے۔ قرآن پاک میں ابولہب کا حوالہ ملتا ہے لیکن ہر دور میں ابولہب رہے ہیں اور رہیں گے۔ قرآن پاک کا بیان سب پر منطبق ہوتا ہے۔ عہد نبویؐ کے منافقوں کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن پاک بعض آفاقی صداقتوں کا اظہار کرتا ہے جو ہر معاشرہ کے اور ہر دور کے منافقوں پر بھی منطبق ہو سکتی ہیں۔ اس نکتے کو دھیان میں نہ رکھنے سے آدمی قرآنی ہدایات کو سمجھنے اور مستقبل میں افراد اور معاشرہ کی تشکیل اور اصلاح کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے بلکہ اس خیال اور تصور پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ قرآنی ہدایت ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص تھیں۔ قرآن پاک کا یہ ایک قطعی دعویٰ ہے کہ وہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور کسی مسلمان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ ہمارے سامنے ایک رہنما اصول کی حیثیت سے رہنا چاہئے۔ تدبر فی القرآن اور استنباط و تفسیر کے مرحلے پر آیات سے آفاقی ہدایت حاصل کرنے پر ہمیں خاص توجہ مبذول کرنا چاہئے۔ موجودہ زندگی اور زمانے کے مسائل کے بارے میں ہمیں قرآن کریم سے واضح اور غیر مبہم ہدایات ملیں گی، بشرطیکہ ہم یہ روش اپنائیں، بجائے اس کے کہ ہم شان نزول اور انبیاء کی تاریخ یا الفاظ کے اشتقاقی بحثوں کی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کریں، ان مباحث کے ساتھ ساتھ ہم کو قرآن کریم کی آیات کے مفاہیم پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کرنا چاہئے کہ ہماری فردی اور اجتماعی زندگی کے لئے کیا ہدایات ملتی ہیں۔

گذشتہ کتابوں کا محافظ

قرآن پاک کا دوسری آسمانی کتابوں خصوصاً

توریت و انجیل کے ساتھ کیا رابطہ ہے؟ یہاں بھی قرآن پاک کی نوعیت اور اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کوتاہی نے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو دنیا کے تمام انبیاء اور رسولوں پر یقین اور سارے مذاہب کے اندر موجود سچائیوں اور صداقتوں کو تسلیم کرنے کی وسیع بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ تمام واقعی نبیوں نے ایک ہی مذہب کی تبلیغ کی اور یہ کہ تمام آسمانی کتابیں ایک لگاتار اور مسلسل نزول کے مختلف حلقے ہیں۔ قرآن پاک اعلان کرتا ہے ''وان من امة الا خلا فیها نذیر'' کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے پاس ایک ڈرانے والا نہ پہونچا ہو۔ (سورہ ۳۵: آیت ۲۴)

قرآن پاک میں تمام نبیوں کے نام کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ''کچھ ان میں وہ ہیں جن کا تذکرہ ہم نے تجھ سے کیا اور بعض وہ ہیں جن کا تذکرہ تجھ سے نہیں کیا۔

(سورہ ۷۸: آیت ۴۰)

صداقت و سچائی شروع سے ایک ہی رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھوٹ سچ سب آپس میں مل جاتے ہیں اور انبیاء کی سچی تعلیمات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اسلامی نظام درحقیقت اس خدائی پیغام کی تکمیل ہے جو گذشتہ انبیاء کو بھیجا گیا قرآن پاک تورات و انجیل کی وحی کا تسلسل ہے۔ اور گذشتہ مقدس کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔

''اور ہم نے آپ پر کتاب کو سچائی دے کر بھیجا جو اس سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور اسکی محافظ ہے۔ (سورہ ۵: آیت ۴۸)

چونکہ اللہ ہی وحی کا سرچشمہ ہے اسلئے تورات و انجیل اور قرآن پاک میں یکساں تعلیمات کا ہونا فطری بات ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک کی تعلیم دوسرے سے مستعار ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن پاک نہ صرف یہ کہ ان مقدس کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے بلکہ ان کا محافظ بھی ہے۔ یہ ان کی اصلی تعلیمات کی نگہداشت کرتا ہے اور ان بے شمار نظریوں اور عقیدوں کی تصحیح کرتا ہے جو تحریفات کے نتیجے میں ان کتابوں کے اندر راہ پا گئے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے اگر قرآن پاک کے بعض بیانات بائبل کے بیانات سے مختلف ہوں۔

متون مقدس کے اختلافات میں قرآن پاک ایک منصف کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن پاک کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مختلف عقائد اور نظریوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لئے آیا ہے کہا گیا ہے۔ ''ہم نے یہ کتاب نازل نہیں کی ہے مگر اس لئے کہ آپ واضح کر دیں ان پر چیزوں کو جن میں وہ اختلافات کر رہے ہیں۔''

(سورہ ۱۶: آیت ۶۳، ۶۴)

اس طرح فرقوں اور نظریوں کے درمیان تمام مذہبی اور غیر مذہبی معاملات میں قرآن پاک صداقت کا واحد معیار ہے۔

ماہیت قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے یہ تمام نکات پیش نظر رہنے چاہئے۔ ان نکات کو پیش نظر رکھ کر ہم تفسیر کی صحیح روش اور مدد کا بھی ادراک کرتے ہیں۔

معراج انسانیت

سیرت امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب اور امام موسیٰ کاظم علیہما السلام کی روشنی میں

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

امام علی علیہ السلام

ولادت: ۱۳-رجب ۳۰ عام الفیل

شہادت: ۲۱-ماہ رمضان ۴۰ھ

رسولؐ کے بعد دوسری معیاری شخصیت جو ہمارے سامنے ہے وہ حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی ہے۔

آپ کی دس سال کی عمر ہے جب پیغمبرؐ مبعوث برسالت ہوتے ہیں اور علیؑ بن ابیطالبؑ ان کی رسالت کے گواہ ہوتے ہیں یہ پہلے ہی سے رسولؐ کی آغوشِ تربیت میں تھے اب اسی آغوش میں دعوت اسلام کی پرورش شروع ہوئی یوں کہنا چاہیے کہ اسلام نے آنکھ کھول کر انہیں دیکھا اور ان کی نگاہ وہ تھی کہ اعلان رسالت کے پہلے رسولؐ کی رسالت کو دیکھ رہے تھے۔ خود اپنے بچپن کی کیفیت نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں بتائی ہے:

کنت اتبعه اتّباع الفصیل اثر امه اشم ریح النبوۃ واریٰ نور الرسالۃ۔

میں رسولؐ کے پیچھے پیچھے یوں رہتا تھا جیسے ناقہ کا بچہ ناقہ کے پیچھے رہتا ہے۔ میں نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا اور رسالت کی روشنی دیکھتا تھا۔

اب ظاہر ہے کہ ان کو رسولؐ سے کتنا انس ہونا چاہیے۔ پھر وہ قرابت کی محبت الگ جو بھائی ہونے کے اعتبار سے ہونا چاہیے اور وہ الگ جو بحیثیت ایک گھر میں رہنے کے ہونا چاہیے اور وہ اس کے علاوہ جو اپنے مربی سے ہونا چاہیے اور وہ اس کے ماوراء جو ان سے بحیثیت رسولؐ اور ان کے پیغام سے بحیثیت حقانیت ہونا چاہیے۔

ابھی اگر چہ دس برس کی عمر ہے مگر عرب اور بنی ہاشم کے اور وہ بھی اس وقت کے دس برس کے بچے کو اپنے ہندوستان کا اس زمانہ کا دس برس کا بچہ نہ سمجھنا چاہیے اور پھر وہ بھی علیؑ ایسا بچہ۔ پھر اس وقت تو دس ہی برس کی عمر ہے مگر اس کے بعد ۱۳ برس رسولؐ کے مکہ میں گذرنا ہیں اور یہی انتہائی پر آشوب اور تکالیف وشدائد سے بھرا ہوا دور ہے ہجرت کے وقت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی عمر ۲۳ برس ہوئی، دس برس سے ۲۲ برس کا درمیانی وقفہ وہ ہے جس میں بچپنا قدم بڑھاتا ہوا مکمل شباب کی منزل تک پہنچتا ہے۔ یہ زمانہ جوش وخروش کا ہوتا ہے یہ زمانہ ولولہ و امنگ کا ہوتا ہے بڑھتی ہوئی حرارت، شباب کی منزلیں اس دور میں گزر رہی ہیں۔ عام انسانوں کے لیے یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں نتائج وعواقب پر

نظر کم پڑتی ہے انسان ہر دشوار منزل کو سہل اور ہر ناممکن کو ممکن تصور کرتا ہے اور مضرتوں کا اندیشہ دماغ میں کم لاتا ہے۔ یہاں یہ دور اس عالم میں گزر رہا ہے کہ اپنے مربی کے جسم پر پتھر مارے جارہے ہیں سر پر خس و خاشاک پھینکا جاتا ہے۔ طعن و تشنیع و شماتت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا پھر فطری طور پر یہی سب وطعن و تشنیع و شماتت ہر اس شخص کو جو رسولؐ سے وابستہ ہے اپنی ذات کیلئے بھی سننا پڑتی ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ رسولؐ کے ہم عمر یا مقابل پھر بھی سن رسیدہ ہو سکتے ہیں لیکن علیؑ ابن ابیطالبؑ کے ہم عمر جو مخالف جماعت میں تصور کئے جاتے ہیں وہ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اپنے سن و سال کے لحاظ سے بھی ہر خفیف الحرکاتی پر ہر وقت آمادہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ علیؑ ابن ابیطالبؑ کہ جو رسولؐ سے اتنی شدید وابستگی رکھتے تھے کیسی کیسی دل آزاری کرتے تھے کیا کیا طعنے اور کیا کیا زخم زبان پہنچاتے تھے۔ اسے کوئی راوی نہ بھی بیان کرے تو بھی ہر صاحب عقل کچھ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے۔

اب ممکن ہے کہ اس وقت ابھی دنیا علیؑ ابن ابیطالبؑ کو بالکل نہ سمجھتی ہو کہ وہ کیا ہیں؟ مگر اب اس وقت تو تاریخ کے خزانہ میں علیؑ ابن ابیطالبؑ کی وہ تصویر بھی موجود ہے جو ہجرت کے ایک سال بعد بدر میں اور پھر دو سال بعد احد میں اور پھر خیبر اور خندق اور ہر معرکہ میں نظر آتی ہے۔

جذبات کے لحاظ سے، قوت دل کے اعتبار سے، جرأت و ہمت کی حیثیت سے ۲۲ سال اور ۲۳ سال اور پھر ۲۵ سال میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ یقیناً علیؑ جیسے ہجرت کے ایک دو اور تین سال بعد بدر و احد اور خندق و خیبر میں تھے ایسے ہی ہجرت کے وقت اور ہجر کے دو چار سال پہلے بھی تھے یہی بازو، یہی بازوؤں کی طاقت، یہی دل اور یہی دل کی ہمت، یہی جوش، یہی عزم غرض کہ سب کچھ اب بعد میں نظر آرہا ہے۔ اب اس کے بعد قدر کرنا پڑے گی کہ اس ہستیؑ نے وہ ۱۳ برس اس عالم میں کیونکر گزارے۔

اور کوئی غلط روایت بھی یہ نہیں بتاتی کہ کسی وقتؑ علیؑ نے جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کردیا ہو جس پر رسولؐ کو کہنا پڑا ہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یا کسی وقت پیغمبر کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ یہ ایسا کرنے والے ہیں تو بلا کر روکا ہو کہ ایسا نہ کرنا! مجھے اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔

کسی تاریخ اور کسی حدیث میں غلط سے غلط روایت ایسی نہیں حالانکہ حالات ایسے ناگوار تھے کہ کبھی کبھی سن رسیدہ افراد کو جوش آگیا اور انھوں نے رسولؐ کے مسلک کے خلاف کوئی اقدام کردیا اور اس کی وجہ سے انہیں جسمانی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر حضرت علی ابن ابیطالبؑ سے کسی سے تصادم ہوگیا ہو اس کے متعلق کمزور سے کمزور روایت پیش نہیں کی جاسکتی۔

یہ وہ غیر معمولی کردار ہے جو عام افراد انسانی کے لحاظ سے یقیناً خارق عادت ہے۔ یہ کسی جذباتی انسان کا کردار نہیں ہوسکتا، یہ ۱۳ برس کی طولانی مدت، اس عمر میں جو ولولوں کی عمر ہے، حوصلوں کی عمر ہے بھلا ممکن ہے اس سکون کے ساتھ گزاری جاسکے۔

اسکے بعد ہجرت ہوتی ہے۔ ہجرت کے وقت وہ فداکاری، پیغمبرؐ کا فرمانا کہ آج رات کو میرے بستر پر لیٹو، میں مکہ سے روانہ ہوجاؤں گا۔ پوچھا حضور کی زندگی تو اس صورت میں محفوظ ہوجائے گی۔ فرمایا ہاں مجھ سے وعدہ ہوا ہے میری حفاظت ہوگی یہ سن حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ نے سرسجدہ میں رکھ دیا کہا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا۔ چنانچہ رسولؐ تشریف لے گئے اور آپ پیغمبرؐ کے بستر پر آرام کرتے رہے اس کے بعد چند روز مکہ معظّمہ میں مقیم رہے مکہ میں مشرکین کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کیں اور پیغمبرؐ کی امانتیں ساتھ لیں یعنی مخدراتِ کاشانۂ رسالت جن میں فواطم یعنی فاطمہ بنت محمدؐ، فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر بن عبدالمطلب تھیں ان کو لے کر روانہ ہوئے خود مہار شتر ہاتھ میں لی اور حفاظت کرتے ہوئے پاپیادہ مدینہ پہنچے یہاں آنے کے ایک سال بعد اب جہاد کی منزل آئی اور پہلی ہی جنگ یعنی بدر میں علیؑ ایسے نظر آئے جیسے برسوں کے نبردآزما، معرکے سر کئے ہوئے اور کڑیاں میدان کی جھیلے ہوئے۔

ادھر کے سب سے بڑے تین سورما عتبہ، شیبہ اور ولید، ان میں سے شیبہ کو جناب حمزہؑ نے تہ تیغ کیا۔ عتبہ اور ولید دونوں کا حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی تلوار سے خاتمہ ہوا یہ کارنامہ خود جنگ کی فتح کا ضامن تھا۔ وہ تو صرف نفسیاتی طور پر عامہ مسلمین میں قوت دل پیدا کرنے کے لئے اس جہاد میں فرشتوں کو فوج بھی آگئی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ گھبرانا نہیں وقت پڑے گا تو فرشتے آجائیں گے۔ حالانکہ اس کے بعد پھر کسی غزوہ میں ان کا آنا ثابت نہیں۔ اس کے باوجود احد میں علیؑ ابن ابیطالبؑ نے تن تنہا بگڑی ہوئی لڑائی کو بنا کر اور فتح حاصل کر کے دکھلا دیا کہ بدر میں بھی اگر فوج ملائکہ نہ آتی تو یہ دست و بازو اس جنگ کو بھی سر کر ہی لیتے۔ اس کے بعد خندق ہے خیبر ہے حنین ہے یہاں تک کہ ان تمام کارناموں سے علیؑ کا نام دشمنوں کے لیے مرادف موت بن گیا۔ خیبر و خندق، ذوالفقار اور علیؑ میں دلالت التزامی کا رشتہ قائم ہوگیا کہ ایک کے تصور سے ممکن ہی نہیں دوسرے کا تصور نہ ہو۔ یہ وہی ۱۳ برس تک خاموش رہنے والے علیؑ ہیں۔ ان دس برس کے اندر جن کا عالم یہ ہے مگر اسی دوران میں حدیبیہ کی منزل آتی ہے اور وہی ہاتھ جس میں جنگ کا علم ہوتا تھا یہاں اسی میں صلح کا قلم ہے جو صاحب سیف تھا وہی صاحب قلم نظر آتا ہے اور ان شرائط صلح کو جن پر فوج اسلام کے اکثر افراد میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور اسے کمزوری سمجھا جارہا ہے بلا کسی بے چینی اور بغیر کسی تردد و تذبذب کے حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ تحریر فرمارہے ہیں جس طرح میدان جنگ میں قدم میں تزلزل اور ہاتھ میں ارتعاش نظر نہیں آیا اسی طرح آج عہد نامۂ صلح کی تحریر میں ان کے قلم میں کوئی تزلزل اور انگلیوں میں کوئی ارتعاش نہیں ہے۔ ان کا جہاد تو وہی ہے جس میں مرضیٔ پروردگار ہو۔ جس کی راہ میں تلوار چلتی تھی اسی کی راہ میں آج قلم چل رہا ہے اور صلح نامہ کی کتابت ہورہی ہے۔

اس زمانہ میں ایک ملک بھی فتح کرنے بھیجے گئے تھے اور وہ یمن ہے مگر وہ شمشیر زن اور صاحب ذوالفقار ہوتے ہوئے یہاں تلوار سے کام نہیں لیتے۔ انہوں نے اسلامی فتح کا مثالیہ پیش کر دیا۔ پورے یمن کو صرف زبانی

تبلیغ سے ایک دن میں مسلمان بنالیا۔ ایک قطرۂ خون نہیں بہا دکھا دیا کہ فتح ممالک اس طرح کرو۔ ملک پر قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ اہل ملک کو اپنا بنالو بس ملک تمہارا ہو گیا۔

بہرحال ان دو مثالوں کو چھوڑ کر حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی زندگی کے اس دور میں بہت سے مواقع پر تلوار نمایاں نظر آئے گی اور **لافتی الا علی لاسیف الا ذوالفقار** میں آپ کی شان مضمر معلوم ہوگی مگر اب پیغمبرؐ خدا کی وفات ہو جاتی ہے اس وقت حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی عمر ۳۳ برس کی ہے اسے اواخر شباب بلکہ بھرپور جوانی کا زمانہ سمجھنا چاہیے مگر اس کے بعد پچیس سال کی طولانی مدت حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ یوں گزارتے ہیں کہ تلوار نیام میں ہے اور آپ کا مشغلہ عبادت الٰہی اور آزوقہ کی فراہمی کے لیے محنت و مزدوری کے سوا بظاہر اور کچھ نہیں۔

یہ ایسی وادیٔ پرخار ہے جس میں ذرا بھی کھل کر کچھ کہنا تحریر کو مناظرانہ آویزشوں کی آماجگاہ بنا دینا ہے۔ پھر بھی یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات لازماً ہے کہ باوجودیکہ یہ مسلمانوں کی جنگ آزمائیوں کا زمانہ اور فتوحات عظیمہ کا دور ہے جس میں اسلام قبول کرنے کے بعد گمنام ہو جانے والے افراد سیف اللہ اور فاتح ممالک اور غازی بن رہے ہیں پھر بھی جو تلوار ہر مقام پر عہد رسولؐ میں کارنمایاں کرتی نظر آتی تھی وہ اس دور میں کلیۃً نیام کے اندر ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ وہ جو ہر میدان کا مرد تھا اب گوشۂ عافیت میں گھر کے اندر ہے۔ اگر اس کو بلایا نہیں جاتا تو کیوں؟ اور اگر بلایا جاتا ہے اور وہ نہیں آتا تو کیوں؟ دونوں باتیں تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے عجیب رہی ہیں ایسا بھی نہیں کہ وہ بالکل غیر متعلق ہے نہیں اگر کبھی کوئی مشورہ لیا جاتا ہے تو وہ مشورہ دے دیتا ہے کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور اس کے حل کرنے کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ حل کر دیتا ہے مگر ان لڑائیوں میں جو جہاد کے نام سے ہو رہی ہیں اسے شریک نہیں کیا جاتا نہ وہ شریک ہوتا ہے۔ ۲۵ سال کی طولانی مدت گزری اور اب حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی عمر ۵۸ سال کی ہوگئی یہ پیری کی عمر ہے جس طرح مکہ کی ۱۳ برس کی خاموشی کے درمیان بچپنا گیا تھا اور جوانی آئی تھی اسی طرح اس پچیس برس کی خاموشی کے دوران میں جوانی گئی اور بڑھاپا آیا۔ گویا ان کی عمر کا ہر دور راہِ صبر و تحمل اور ضبط و سکون کے عالم میں آتا رہا۔ بھلا اب کسے تصور ہو سکتا ہے کہ جس کی جوانی گزر کر بڑھاپا آ گیا اور اس نے تلوار نیام سے نہ نکالی وہ اب کبھی تلوار کھینچے گا اور میدان جنگ میں حرب و ضرب کرتا نظر آئے گا۔ عالم اسباب کے عام تقاضوں کے لحاظ سے تو اس پچیس برس کے عرصہ میں ولولہ و امنگ کی چنگاریاں تک سینہ میں باقی نہیں رہیں۔ ہمت کے سوتے خشک ہو گئے اور اب دل میں ان کی نمی تک نہیں رہ گئی۔ اب نہ دل میں وہ جوش ہو سکتا ہے نہ بازوؤں میں وہ طاقت، نہ ہاتھوں میں وہ صفائی اور نہ تلوار میں وہ کاٹ مگر ۵۸ سال کی عمر میں وہ وقت آ گیا کہ مسلمانوں نے باصرار زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں دے دی آپ نے بہت انکار کیا مگر مسلمانوں نے تضرع و زاری کی حد کر دی اور حجت ہر طرح تمام ہوگئی۔ لیکن جب آپ سریر خلافت پر

متمکن ہوئے اور اس ذمہ داری کو قبول کر چکے تو کئی جماعتوں نے بغاوت کر دی۔ آپ نے ہر ایک کو پہلے تو فہمائش کی کوشش کی اور جب حجت ہر طرح تمام ہوگئی تو دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر و احد اور خندق و خیبر میں چمک چکی تھی اب جمل، صفین اور نہروان میں چمک رہی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ فوجیں بھیج رہے ہوں اور خود گھر میں بیٹھیں بلکہ خود میدان جنگ میں موجود اور بنفس نفیس جہاد میں مصروف اب ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نوجوان طبیعت جو مقابل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو۔ کیونکہ حضرت کی ہیبت فوج دشمن کے ہر سپاہی کے دل پر تھی اس لیے صفین میں جب آپ میدان میں نکل آتے تھے تو پھر مقابل جماعت کا پرا بند ہو جاتا تھا اور کوئی مقابلہ کو باہر نہ آتا تھا۔ اسے دیکھ کر آپ نے یہ صورت اختیار فرمائی تھی کہ دوسرے اپنے ہمراہیوں کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے تھے۔ چونکہ جنگ کا لباس خود و مغفر اور زرہ و بکتر وغیرہ پہننے کے بعد چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے لباس بدلنے کے بعد پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کون ہے اور آپ کبھی عباس بن ربیعہ اور کبھی فضل بن عباس اور کبھی کسی اور کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے تھے اور اس طرح بہت سے نذر تیغ ہو جاتے تھے۔

لیلۃ الہریر میں طے کر لیا کہ فتح کے بغیر جنگ نہ رکے گی۔ پورے دن لڑائی ہو چکی تھی سورج ڈوب گیا تب بھی لڑائی نہ رکی۔ پوری رات جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ نقشۂ جنگ بدل گیا اور صبح ہوتے ہوتے فوج شام سے قرآن نیزوں پر بلند ہو گئے جن سے التوائے جنگ کی درخواست مطلوب تھی اور یہ جنگ میں شکست کا کھلا ہوا اعلان تھا۔

یہ ۶۰ برس کی عمر میں جہاد ہے اور یہی وہ ہیں جو تینتیس برس کی عمر سے ستاون برس تک کی مدت یوں گزار چکے ہیں جیسے کہ سینہ میں دل ہی نہیں اور دل میں ولولہ اور جنگ کا حوصلہ ہی نہیں۔

اب ایسے انسان کو کیا کہا جائے؟ جنگ پسند یا عافیت پسند؟ ماننا پڑے گا کہ یہ کچھ بھی نہیں ہیں یہ تو فرائض کے پابند ہیں جب فرض ہوگا خاموشی کا تو خاموش رہیں گے چاہے شباب کی حرارت اور اس کا جوش و ولولہ کچھ بھی تقاضہ رکھتا ہو۔ اس وقت کتنے ہی صبر آزما مشکلات پیش آتے رہیں وہ صبر کریں گے اور گھبرائیں گے نہیں۔

اور جب فرض محسوس ہوگا کہ تلوار اٹھائیں تو تلوار اٹھائیں گے، چاہے بڑھاپے کا انحطاط جو عام افراد میں اس عمر میں ہوا کرتا ہے کچھ بھی تقاضہ رکھتا ہو اب حرب و ضرب کی سختیوں کا مقابلہ کرنے میں وہ جوانوں سے آگے نظر آئیں گے یہی وہ ''معراج انسانیت'' ہے جہاں تک طبیعت، عادت اور جذبات کے تقاضوں میں گرفتار انسان پہنچا نہیں کرتے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

ولادت: ۷-رصفر ۱۲۸ھ وفات: ۲۵-ررجب ۱۸۲ھ

آپ کے زمانہ میں سیاست کا شکنجہ پھر سخت ہو گیا اب نہ تعلیم و تدریس کی وہ آزادی رہی نہ تبلیغ و اشاعت کے مواقع باقی رہ گئے حکومت وقت برابر آپ سے برسر پرخاش رہی یہاں تک کہ آخر عمر کے کئی سال تمام و کمال قید خانہ میں گزر گئے مگر آپ کی بلند سیرت کی روشنی اتنی تیز تھی کہ قید خانہ

کی اونچی اور سنگین دیواریں اس کے لیے ایک نازک و باریک پردہ سے زیادہ نہ تھیں جس کے اندر سے اس کی شعاعیں چھن چھن کر باہر نکلتی رہیں یہاں تک کہ چودہ صدیاں پار کر کے ہم تک بھی پہنچ سکی ہیں۔ چنانچہ اسی سیرت کی بلندی کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت وقت کے مقرر کردہ قیدخانوں کے افسر آپ کی نیکوکاری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے تھے اور آپ کے ساتھ سختی کرنے سے معذور رہتے تھے جس کے نتیجہ میں بار بار نگرانوں کے بدلنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلے آپ کو بصرہ میں عیسیٰ بن جعفر بن منصور کی نگرانی میں رکھا گیا اس ہدایت کے ساتھ کہ ان کو قید تنہائی میں رکھو اور کچھ دن کے بعد حکم دیا کہ انہیں قتل کر دو۔ وہ خلیفۂ وقت کا چچا زاد بھائی تھا مگر اس کے دل پر امام موسیٰ کاظمؑ کے حسن کردار کا اثر پڑ گیا تھا اس نے لکھا کہ میں نے ان کے حالات کی خوب جانچ کی ہے وہ تو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے ہیں اور شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں تنہائی کے عالم میں بھی ہم میں سے کسی کے لیے کبھی بددعا نہیں کرتے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے مجھے اپنی عبادت کے لیے یہ تنہائی کی جگہ عطا فرمائی۔ ایسے خدا ترس اور عبادت گزار کی جان لینا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

جب اس نے انکار کیا تو آپ کو بصرہ سے بلوا کر بغداد میں فضل بن ربیع کے سپرد کیا گیا۔ مگر فضل پر بھی آپ کے کردار کے مشاہدہ کا خاص اثر پڑا۔ آخر فضل بن ربیع کو بھی اس صورت سے برطرف کیا گیا۔ یحییٰ برمکی کو براہ راست نگراں بنا دیا گیا اور اس سے بھی پھر غیر مطمئن ہو کر سندی بن شاہک کو مقرر کیا گیا۔ یہ ایسا قسی القلب اور سفاک تھا کہ اس نے زہر دغا دے کر امامؑ کی زندگی کا خاتمہ کیا۔

زندگی میں قیدخانہ میں محبوس رکھے گئے اور پھر قبر کے اندر مدفون ہو گئے مگر ان کے اوصاف و کمالات، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت ہی نہیں بلکہ ان کے زبان و قلم سے نکلے ہوئے بہت سے ارشادات و تعلیمات اور شریعت نبوی کے احکام اب تک کتابوں کے صفحات پر موجود ہیں جو بتا رہے ہیں کہ وہ اسی سلسلہ کی ایک فرد تھے جن میں سے ہر ایک اپنے دور کے حالات کے مطابق کاروان بشر کو منزل کمال انسانیت تک پہنچانے کے لیے رہنمائی کا فرض انجام دیتا رہا اور اپنے کردار کی رفعت سے ''معراج انسانیت'' کی نشاندہی کرتا رہا۔

اقوال امام علیؑ

❁ عقلمند وہ شخص ہے جو دوسروں کی معلومات سے اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔

❁ جو لوگ اپنی دنیا سنوارنے کے لئے دین سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں تو خدا اس دنیوی فائدے سے کہیں

❁ زیادہ ان کے لئے نقصان کی صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔

❁ بدترین دوست وہ ہے جو تمہیں معصیت (گناہ) کی طرف مائل کرے۔

ہمارے ائمہ اور سیاسی جدوجہد

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی صاحب

ائمہ علیہم السلام کی مظلومیت ان بزرگان اسلام کی زندگیوں تک محدود نہیں رہی ، بلکہ آج سیکڑوں سال گزر جانے کے باوجود ان حضرات کی سیرت کا ایک اہم ترین بلکہ اصلی ترین رخ لوگوں کی عدم توجہی کا شکار ہے جس نے ائمہ کی مظلومیت کو تاریخی استمرار عطا کر دیا ہے ۔ یقیناً گذشتہ صدیوں میں بڑی ہی بے مثال اور قیمتی کتابیں اور مقالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں کیونکہ ان پاک اور بزرگ ہستیوں کی زندگیوں سے متعلق تمام روایات مختلف مجموعوں کی شکل میں آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کر دینا ایک بڑا کارنامہ ہے پھر بھی ''سیاسی جدوجہد کے نقوش'' جو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی تقریباً دوسو پچاس سال کی ظاہری زندگی کے اہم ترین اور ممتاز ترین پہلو ہیں، ان بے شمار احادیث و روایات اور ان کے علمی و معنوی پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی سوانح حیات میں تقریباً گم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہمیں ائمہ علیہم السلام کی زندگی، درس اور اسوہ کے عنوان سے ہمہ وقت یاد رکھنی چاہیے نہ کہ اس کا ہم صرف ایک شاندار قابل فخر یادگار کے عنوان سے وقتاً فوقتاً ذکر کر لیا کریں اور بس۔ چنانچہ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان عظیم ہستیوں کی سیاسی روش اور ان کے طریقہ کار پر بھی توجہ دیں۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے اس رخ نے خاص طور پر متاثر کیا ہے اور میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ میرے ذہن میں یہ خیال ۱۹۷۱ء ان سخت ترین امتحانی ایام میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی ائمہ معصومینؑ کی زندگی کے اس رخ سے غافل نہیں تھا اور اعلائے کلمۂ توحید و استقرار حکومت الٰہی کے سلسلہ میں ان عظیم مجاہدوں کی قربانی و فداکاری میرے پیش نظر تھی پھر بھی وہ نکتہ جو اس گھڑی ناگہانی طور پر میرے ذہن میں روشن ہوا یہ تھا کہ ان بزرگواروں کی زندگی ـــــ اس ظاہری تفاوت کے باوجود جس کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تناقض کردار کا گمان کیا ہے ـــــ دراصل مجموعی طور پر ایک مسلسل اور طولانی تحریک ہے جو ۱۱ھ سے شروع ہوئی ہے اور دوسو پچاس سال تک مسلسل جاری رہ کر ۲۶۰ھ میں غیبت کبریٰ کی ابتداء کے ساتھ منتہی ہو جاتی ہے یہ تمام ہستیاں مل کر ایک واحد کردار و شخصیت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب کا راستہ اور مقصد ایک ہی ہے لہٰذا ہم بجائے اس کے کہ زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کا الگ اور زندگی سید الشھداءؑ کا الگ اور زندگی سید سجادؑ کا الگ جدگانہ طور پر جائزہ لیں اور پھر احیاناً اس خطرناک اشتباہ اور دام میں گرفتار ہو جائیں کہ ان تینوں ائمہؑ کی زندگیوں میں

بظاہر فرق ان کے درمیان اختلاف وتعارض کی نشاندہی کرتا ہے، ہم ان سب کی زندگی کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی فرض کریں جس نے دوسو پچاس سال کی عمر پائی ہو اور ۱۱ھ سے لیکر ۲۶۰ھ تک ایک ہی راہ پر مسلسل طور پر گامزن رہا ہو اس طرح اس عظیم اور معصوم زندگی کا ایک عمل قابل فہم اور لائق توجیہ ہو جائے گا۔

ہر وہ انسان جو عقل وحکمت سے مالا مال ہوگا، چاہے وہ معصوم نہ بھی ہو، جب وہ اتنی طویل مدت طے کرے گا تو حتمی طور پر وقت اور حالات کے تحت مناسب حکمت عملی اختیار کرے گا۔ ممکن ہے وہ کبھی تیزی کے ساتھ حرکت کرنا ضروری سمجھے اور کبھی سست رفتاری میں مصلحت سمجھے حتیٰ ممکن ہے کبھی وہ کسی حکیمانہ تقاضے کے تحت پسپائی بھی اختیار کرلے ۔تو ظاہر ہے وہ لوگ جو اس کے علم وحکمت اور ہدف ومقصد سے دوستی کا علم رکھتے ہیں اس کی عقب نشینی کو بھی پیش قدمی شمار کریں گے ۔ اس نقطۂ نظر سے امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے ساتھ اور آپ کی زندگی سید الشھداء امام حسینؑ کی زندگی کے ساتھ اور حضرت کی زندگی دیگر آٹھ ائمہ کی زندگیوں کے ساتھ ۲۶۰ھ تک ایک مسلسل تحریک کہی جاسکتی ہے۔

یہ وہ خیال تھا جس کی طرف میں اس وقت متوجہ ہوا اور پھر اسی نقطۂ نظر سے میں نے ان عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا میری اس فکر کو تائید حاصل ہوتی گئی۔

اگر چہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کرنا ایک نشست میں ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ پیغمبرؐ اسلام کی ذریت طاہرہ یعنی ائمہ معصومینؑ کی پوری زندگی ایک خاص سیاسی موقف کے ہمراہ رہی ہے لہٰذا یہ اس قابل ہے کہ اس کو جداگانہ طور پر مستقل عنوان کی حیثیت سے مورد بحث قرار دیا جائے ۔لہٰذا میں مختصر طور پر یہاں اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلی چیز یہ عرض کرنا ہے کہ ائمہ کی فیصلہ کن سیاسی جدوجہد سے ہماری مراد کیا ہے؟

میری نظر میں ائمہ کی مجاہدانہ کوششوں کو محض علمی، اعتقادی اور کلامی مبارزہ کا نام دینا درست نہیں ہے جس طرح کی کلامی تحریکوں کی مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں جیسے معتزلہ واشاعرہ وغیرہ کی تحریکیں، علمی نشستوں میں ائمہ کی شرکت، حلقۂ درس کی وسعت، بیان حدیث ونقل معارف اسلامی اور احکام فقہی کی تشریح وتوضیح وغیرہ فقط اسی لئے نہیں تھی کہ علم فقہ یا علم کلام سے متعلق اپنے مکتب فکر کی حقانیت ثابت کردی جائے بلکہ ان سے کہیں زیادہ اہم مقاصد مضمر تھے۔

اسی طرح اس کو اس نوعیت کا مسلحانہ قیام کہنا بھی درست نہیں ہے جیسا کہ جناب زید شہید اور ان کے بعد ان کے ورثہ یا بنی الحسنؑ اور بعض آل جعفرؑ نیز اسی قبیل کے دوسرے افراد کے یہاں ائمہ علیہم السلام کی حیات کے دوران نظر آتا ہے۔ان حضراتؑ نے ایسا کوئی مبارزہ نہیں کیا البتہ اسی مقام پر یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے بطور مطلق ان تمام قیام کرنے والوں کی مخالفت بھی نہیں کی

اگر چہ بعض کی مخالفت بھی کی ہے۔لیکن اس کا سبب مسلحانہ قیام نہیں تھا بلکہ کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔بعض کی بھرپور تائید بھی کی ہے بلکہ بعض کی مختلف عنوان سے پشت پناہی اور مدد بھی کی ہے۔اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابل توجہ ہے آپ فرماتے ہیں:-

لوددت ان الخارجی یخرج من آل محمد و علیٰ نفقة عیاله۔

مجھے یہ پسند ہے کہ کوئی آل محمدؐ و علیؑ میں سے خروج کرے اور اس کے اہل وعیال کے اخراجات کا میں ذمہ دار بنوں۔(اس میں مالی امداد، آبرو کی حفاظت، مخفی جائے تحفظ مہیا کرنا یا اسی طرح کی دوسری مدد بھی شامل ہے) لیکن بہ نفس نفیس خود امام وقت کی حیثیت سے جہاں تک میری نگاہ ہے اس طرح کے موقع پر ان حضرات نے مسلحانہ قیام میں کبھی شرکت نہیں کی۔

چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی جدوجہد سے مراد نہ تو وہ پہلی علمی مبارزہ کی صورت ہے اور نہ ہی اس دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام بلکہ اس سے مراد وہ مبارزہ ہے جو ایک سیاسی ہدف اور مقصد کے تحت ہمیشہ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں نظر آتا ہے۔اور وہ سیاسی مقصد ''ایک اسلامی حکومت کی تشکیل ہے'' جس کو ہم اپنی زبان میں حکومت علوی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۶۰ھ تک مسلسل طور پر ائمہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک الٰہی حکومت قائم کریں اور یہی اصل مدعا ہے البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود اپنے ہی دور میں (یعنی ہر امام اپنے اپنے دور میں) اسلامی حکومت قائم کر دینا چاہتا تھا ممکن ہے یہ جدوجہد مستقبل قریب، مستقبل بعید حتی کہ بعض حالات میں نزدیک ترین مدت سے متعلق رہی ہو مثلاً امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں کی جانے والی کوششیں آئندہ کم سے کم مدت میں اسلامی حکومت کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہیں چنانچہ مسیب ابن نجبہ اور اسی قبیل کے دوسرے افراد نے جب امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ: آپ نے کیوں سکوت اختیار کر لیا؟ تو ان کے جواب میں امامؑ نے جو جملہ ارشاد فرمایا ہے وہ اسی کی طرف اشارہ ہے امامؑ فرماتے ہیں:-

''**ماندری لعله فتنة لکم و متاع الیٰ حین**''

جناب سید سجادؑ کے دور میں یہ کوششیں میری نظر میں مستقبل قریب کے لئے تھیں جس کے لئے ثبوت وشواہد موجود ہیں جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں غالباً نزدیک ترین مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش جاری رہی البتہ امام ہشتم کی شہادت کے بعد کی جانے والی کوششوں کے سلسلہ میں گمان اس بات کا ہے کہ مستقبل بعید کے لئے رہی ہوں۔مختصر یہ کہ یہ حکومت کب قائم ہو اس اعتبار سے جدوجہد کا طریقۂ کار مختلف ہو سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کوششیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔

ائمہ علیہم السلام کی سوائے ان روحی ومعنوی امور کے جو ایک بندہ اپنے خدا سے قربت اور عرفانی مراحل کی

تکمیل کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے ہر طرح کی سرگرمی، درس و تدریس، حدیث وعلم کلام کی موشگافیاں، مخالفین سے علمی و سیاسی مناظرے، مختلف گروہوں کی حمایت یا مخالفت وغیرہ سب کچھ اسی مقصد کے لئے تھی کہ ایک اسلامی حکومت قائم کی جاسکے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے۔

البتہ اس موضوع پر لوگوں کے درمیان اختلاف نظر رہا ہے اور رہے گا اور مجھے بھی قطعی اس پر اصرار نہیں ہے کہ ہر شخص میری فکر اور نظریہ کو آنکھ بند کر کے قبول کر لے بلکہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ بحث کا یہ سرا پوری توجہ اور دقت کے ساتھ مورد نظر قرار دیا جائے اور ائمہ کی زندگی پر اس زاویہ سے تجدید نظر ضرور کی جائے۔ ادھر چند برسوں میں میری تحقیق وجستجو اس محور پر رہی ہے کہ یہ خیال کس حد تک مجموعی طور پر تمام ائمہ علیہم السلام کے بارے میں اور کس حد تک فرداً فرداً ان حضرات کے سلسلہ میں محکم دلائل کے تحت صادق آتا ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ کی بعض دلیلیں کلی نوعیت کی ہیں، مثال کے طور پر:-

ہمیں معلوم ہے کہ امامت، سلسلہ نبوت کی ہی ایک تکمیلی کڑی ہے اور نبیؐ کا از اول امام ہونا ثابت ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے بھی ظاہر ہے **ان رسول اللّٰہ کان ھو الامام**......اور رسول اللہ صلعم نے حق وعدالت پر مبنی ایک الٰہی نظام قائم کرنے کے لیے ہی قیام فرمایا تھا اور ایک عرصہ تک اپنی انتھک جدوجہد کے بعد اس طرح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو بھی ہو گئے تھے جس کی تا حیات آپؐ حفاظت بھی کرتے رہے۔ لہٰذا امام جو جانشین نبی ہے، ایک ایسے نظام سے ہر گز غفلت اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ استدلال کی ایک کلی صورت ہے البتہ اس ذیل میں بحث وگفتگو اور مختلف نکات پر غور وخوض کے ذریعہ تحقیق کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ہماری بعض دلیلیں جو خود ائمہ علیہم السلام کے ان کلمات سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے بطور دلیل کے صادر فرمائے ہیں یا ان کے اس طریقۂ زندگی سے مستفاد ہیں جو اس نکتہ کی طرف متوجہ رہنے اور اس اعلیٰ مقصد کو ذہن میں رکھنے کے بعد اپنے اندر معنی پیدا کر لیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنے آپ کو اس زمانہ کی وضعیت اور ماحول میں پہونچا کر حالات کا جائزہ لیں تو اس صورت حال کے سمجھنے میں ضرور کسی حد تک مدد مل سکتی ہے جس سے ائمہ نبرد آزما تھے یعنی اگر ہم خود اپنے آپ کو انکی جگہ پر محسوس کریں تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ اس زمانہ (شاہ) میں ہمارے لئے یہ کیفیت حاصل تھی، تاریک و متعفن قید خانے میں پہنچ کر ایک انسان :''**السلام علیٰ المعذب فی قعر السجون و ظلم المطامیر ذی الساق المرضوض بحلق القیود**'' جیسے جملے کا مفہوم اور علت و وجہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ بہر حال اسی نقطۂ نظر کو مرکز بحث قرار دیتے ہوئے اپنے افکار وخیالات آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

جو افراد دوسری صدی ہجری کی سیاسی تاریخ پر بھر پور نظر رکھتے ہیں اور جنہوں نے ۱۰۰ھ سے کچھ قبل سے لیکر ۱۳۲ھ یعنی بنو عباس کے آغاز حکومت تک بنی عباس کی سر گرمیوں کا مطالعہ کیا ہے کسی حد تک ائمہ علیہم السلام کی بھر پور

سیاسی جد و جہد کو اس وقت کی بنی عباس کی سیاسی زندگی سے شبیہ دے سکتے ہیں لیکن جس نے بنوعباس کی زندگی ان کی سیاسی جد و جہد اور ان کی دعوتوں کا قاعدہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے اس کے لئے ہرگز یہ شبیہ قابل فہم ورسا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کے حالات ائمہؑ کی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں بس فرق جوہر کا ہے جو ائمہ کے مقصد اور بنی عباس کے مقصد، ائمہ کی روش اور بنی عباس کی روش، ائمہ کی شخصیت اور بنی عباس کی شخصیت کے درمیان پایا جاتا ہے البتہ شکل ونقشہ کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض موارد میں یہ دونوں راہیں ایک دوسرے میں مخلوط و مدغم نظر آتی ہیں یعنی بنوعباس آل علیؑ کے ساتھ اپنے طریقہ کار، تبلیغات اور نعرہ و دعوت کی یکسانیت وقربت کی وجہ سے عراق وحجاز سے دور علاقوں میں ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ آل علیؑ کی راہ پر ہی کار بند ہیں حتی کہ مسودہ نے بنوعباس کی طرف دعوت آغاز کے وقت جب خراسان ورے میں سیاہ لباس پہنے تو نعرہ لگایا: **ھٰذا السواد، حداد آل محمد و شھداء کربلا و زید و یحیٰ**۔ یعنی یہ سیاہ لباس شہدائے کربلا اور زید ویحیٰ کے ماتم کی علامت ہے۔ چنانچہ یہاں کے بعض رہنے والے حتی کہ سرداران قبیلہ بھی ان سیاہ پوشوں کے بارے میں یہی خیال کرتے تھے کہ یہ لوگ آل علیؑ کے لئے کام کر رہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ میں بھی نظر آتی ہے البتہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، تین بنیادی عنصر ـــــ مقصد، روش اور اشخاص کے فرق کے ساتھ ہے۔ ائمہ کی زندگی میں سیاسی جد و جہد کا یہی مطلب ہے۔

ائمہ کی سیاسی تحریک کی کلی تصویر

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے سیاسی جہاد اور جد وجہد کی کلی طور پر تصویر کشی کر دی جائے اس کے بعد ائمہ کی زندگی سے ان کی سیاسی جد وجہد کے چند روشن نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

اس کلی تصویر کشی کے سلسلہ میں پہلے تین ائمہ یعنی امیر المومنینؑ، حسن مجتبیٰؑ اور سید الشھداء علیہم السلام کی زندگیوں کو فی الحال ہم مورد بحث قرار دینا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ ان کا سیاسی تحریک سے وابستہ ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے چنانچہ ہم اپنی بحث جناب سید سجاد علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں۔

میری نظر میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دور یعنی ۶۱ھ سے لیکر ۲۶۰ھ تک دوسو سال کا عرصہ تین سیاسی سرحدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا مرحلہ ۶۱ھ سے ۱۳۵ھ یعنی منصور عباسی کی ابتدائے خلافت تک پھیلا ہوا ہے اس مرحلہ میں سیاسی جد و جہد ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے پھر گہرائی حاصل کر کے پھیلنا شروع ہوتی ہے اور پورے اوج پر آجاتی ہے یہاں تک کہ ۱۳۵ھ میں سفاح کی موت اور منصور دوانقی کی خلافت کے ساتھ یہ ایک نئے موڑ سے دوچار ہوتی ہے ایسی مشکلات سامنے آتی ہیں کہ بڑی حد تک اس کی ترقی میں ٹھراؤ پیدا

ہوتا نظر آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے سیاسی تحریکوں میں اس طرح کی صورت اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ خود اسلامی انقلاب ایران کے سلسلہ میں ہم ایسی کیفیات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ۱۳۵ھ سے ۲۰۲ھ یا ۲۰۳ھ تک کا ہے جو شہادت امام رضا علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ دور پہلے دور کی بہ نسبت جد و جہد کے اعتبار سے بالاتر عمیق تر اور وسیع تر نظر آتا ہے اگرچہ اس دور کا آغاز سخت مشکلات کے ہمراہ ہوا تھا پھر بھی اس نے رفتہ رفتہ اوج حاصل کر لیا، پھیلا اور قدم بہ قدم کامیابیوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ امام ہشتم حضرت علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس جد و جہد میں پھر توقف پیدا ہو گیا۔

تیسرا مرحلہ ۲۰۴ھ میں مامون رشید کے بغداد چلے جانے کے بعد اسلامی جد و جہد کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے دراصل مامون کی خلافت کے ابتدائی دن ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے نہایت ہی دشوار اور محنت و تعب کے دن ہیں اگرچہ اس دور میں ہمیشہ سے زیادہ تشیع پھیلا، میری نظر میں اس عصر میں ائمہ علیہم السلام کو مصائب و آلام کا مقابلہ ہمیشہ سے زیادہ کرنا پڑا ہے اور یہ وہی زمانہ ہے جب میرے خیال میں، اس سیاسی جد و جہد کا رخ مستقبل بعید کے ہدف کی طرف پھر چکا تھا۔ یعنی اب ائمہؑ کو غیبت صغریٰ سے قبل الٰہی حکومت کے قیام کی امید نہیں رہ گئی تھی ان کی کوششیں مستقبل بعید کے لئے زمین ہموار کرنے کی طرف منتقل ہو چکی تھیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت اور غیبت صغریٰ کی ابتدا ہو جاتی ہے۔　　یہ تینوں ادوار کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جنھیں اجمالی طور پر بیان کروں گا۔

پہلا دور:- یہ دور سید سجادؑ، امام باقرؑ اور صادق اہلبیت طہارتؑ کی زندگی کے ایک حصے پر مشتمل ہے چنانچہ اس کا آغاز بے پناہ دشواریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کربلا کے حادثہ نے دنیائے شیعیت بلکہ پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور قتل و قید و شکنجہ و ظلم کوئی نئی بات نہ تھی لیکن خاندان نبوت کی شہادت اور پھر مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری ان کی شہر بہ شہر تشہیر، فرزندان زہراؑ کے سرہائے بریدہ کا نیزوں پر بلند کیا جانا جبکہ ابھی وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے ان لبہائے مبارک کو پیغمبر اسلامؐ کا بوسہ دینا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ چیزیں تھیں جس نے پورے جہان اسلام کو کو مبہوت و متحیر کر دیا تھا کسی کے تصور میں بھی نہ تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے! اگر یہ شعر جو جناب زینب سلام اللہ علیہا کی طرف منسوب ہے درست ہو کہ ؎

ماتوهمت یا شقیق فؤادی　　کان هذا مقدّرا مکتوبا

دراصل اسی ناقابل تصور درد و کرب کا اظہار ہے اور یہی احساسات تمام لوگوں کے تھے۔ یکایک ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہونے لگا کہ موجودہ سیاست ایک دوسری قسم کی سیاست ہے یہ ظلم و زیادتی اب تک ہونے والی زیادتیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ناقابل تصور چیزوں نے عملی جامہ پہن لیا اور انجام دی گئیں چنانچہ تمام دنیائے اسلام پر ایک عجیب قسم کی دہشت اور رعب کا عالم طاری تھا صرف کوفہ میں توابین اور پھر مختار کی برکت سے کچھ فضا متحرک ہوتی نظر آئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ

مدینۂ منورہ نیز دیگر مقامات پر واقعۂ کربلا کے اثر سے ایسا شدید قسم کا رعب مسلط تھا حتی کہ مکۂ معظمہ میں بھی جہاں کچھ دنوں بعد عبداللہ ابن زبیر نے آواز اٹھائی ایسی کیفیت طاری تھی کہ تاریخ اسلام میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کوفہ میں بھی اگر چہ ۶۴ یا ۶۵ ہجری میں (کیونکہ بظاہر توابین کو ۶۵ ھ میں شہید کیا گیا) توابین کی کوششوں سے وہاں کی مرگ بار بوجھل فضا میں ایک تازہ لہر پیدا ہوئی لیکن دوبارہ توابین کی شہادت نے اس خوف و وحشت میں اور اضافہ کر دیا اور پھر جب اموی کارخانۂ سیاست کے دشمن یعنی مختار اور مصعب ابن زبیر آپس میں لڑ پڑے اور عبداللہ ابن زبیر کو مکہ میں رہ کر بھی اہلبیتؑ کے طرفدار جناب مختار کا وجود کوفہ میں برداشت نہ ہوسکا اور مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں مختار قتل کر دئے گئے اس سے خوف و وحشت میں مزید اضافہ ہوا اور امیدیں، مایوسی سے بدلنے لگیں اور آخر کار جیسے ہی عبد الملک ابن مروان کو تخت بنوامیہ پر تسلط حاصل ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیائے اسلام پر بنوامیہ کی گرفت مضبوط ہوگئی اور اکیس سال تک پورے قدرت و اقتدار کے ساتھ وہ مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ کھیلتا رہا۔

واقعہ حرہ:- اس مقام پر خاص طور پر واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۶۴ ھ میں جس سال مدینۂ رسولؐ پر مسلم بن عقبہ نے چڑھائی کی ہے یہ واقعہ رونما ہوا جو مزید رعب و وحشت پیدا کرنے کا سبب قرار پایا اور جس نے اہلبیتؑ کو مکمل طور پر غربت و مظلومیت میں مبتلا کر دیا۔ اس حادثہ کی حقیقت مختصر طور پر یہ ہے کہ ۶۲ ھ میں یزید نے شامی سرداروں میں سے ایک ناتجربہ کار جوان کو نمایندہ بنا کر مدینہ روانہ کیا جس نے اہل مدینہ کے خیالات یزید کی طرف سے صاف کرنے کیلئے چند افراد کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شام جا کر یزید سے ملاقات کریں چنانچہ کچھ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے شام جا کر یزید سے ملاقات بھی کی اگر چہ یزید نے ان کو بہت زیادہ انعامات (تقریباً پچاس ہزار سے ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا لیکن یہ لوگ جو خود صحابہ میں سے یا اولاد صحابہ میں سے تھے یزیدی دربار کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور زیادہ متنفر اور خشمگین ہو گئے اور جب مدینہ واپس ہوئے تو عبد اللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر کے یزید کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا مرکزی حکومت سے مدینہ کا رابطہ منقطع کر لیا گیا۔ یزید نے بھی مسلم ابن عقبہ کو ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور مدینۂ رسول میں ایسا عظیم المیہ برپا ہوا جس نے تاریخ میں خون کے آنسو رلا دینے والے سسکیوں اور آہوں سے معمور باب کا اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بھی لوگوں میں شدید رعب و وحشت ایجاد کرنے کا سبب بنا۔

فکری انحطاط:- اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے جس نے لوگوں کو دین کی طرف سے بے اعتنا اور لاپرواہ بنا رکھا تھا گذشتہ بیس برسوں کے دوران پورے عالم اسلام میں ایک عجیب فکری انحطاط پیدا ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں دینی تعلیمات کو لوگوں نے یکسر فراموش کر دیا تھا۔ گویا ۴۰ ھ کے بعد تقریباً بیس

سال کے عرصہ میں دین و ایمان کی تعلیم، آیات الٰہی کی تفسیر اور پیغمبرؐ اسلام کے حق و آگہی سے بھرپور بیانات اس حد تک محدود ہو کر رہ گئے تھے کہ عوام الناس اعتبار و ایمان کے لحاظ سے بالکل فرومایہ، کھوکھلے اور دیوالیہ ہو چکے تھے۔ جب ایک انسان اس دور کی عوامی زندگی کا ذرا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور مختلف تاریخوں اور روایتوں میں ان کے حالات کھنگالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی معاشرہ میں علماء و قارئین اور محدثین و مقدسین بالکل ناپید ہو چکے تھے (ان کے بارے میں بھی گفتگو بعد میں آئے گی) پھر بھی عوامی زندگی بلاشبہ بے ایمانی و بے اعتقادی کا شکار تھی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود دربار خلافت سے تعلق رکھنے والے افراد نبوت کو بھی زیر سوال قرار دینے لگے تھے۔ چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ خالد بن عبد اللہ قسری، جس کو بنو امیہ کی پستی و رذالت کا بدترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتا ہے:- ''کان یفضل الخلافۃ علی النبوۃ'' (معاذ اللہ) خلافت نبوت سے بالاتر ہے!! اور اس کے لئے دلیل کے طور پر کہتا تھا کہ ''ایھما افضل؟ خلیفۃ الرجل فی اھلہ او رسولہ الی صحابہ؟'' ''اگر تم ایک شخص کو اپنا جانشین، اپنے خانوادہ میں مقرر کرتے ہو تو وہ شخص تم سے قریب تر ہوگا یا وہ شخص جس کو کسی کے پاس پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا جائے؟ ظاہر ہے جس کو تم اپنے خانوادہ میں منتخب کر کے اپنا جانشین مقرر کرتے ہو وہی تم سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفۃ اللہ (یہ لوگ خلفاء کو خلیفۂ رسول کے بجائے خلیفہ خدا تصور کرنے لگے تھے) رسول اللہ سے بالاتر ہے۔

یہ تو خالد بن عبد اللہ قسری کی بات تھی یقیناً اس طرح کی باتیں دوسرے افراد بھی کرتے رہے ہوں گے جب میں نے بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کے شعراء کے یہاں تلاش کرنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ عبد الملک بن مروان کے زمانہ سے خلفاء کے لئے خلیفۃ اللہ کی تعبیر اس کثرت سے استعمال کی جانے لگی کہ عوام یہ بھی بھول گئے کہ خلیفہ، خلیفۂ پیغمبر بھی ہوتا ہے یہ سلسلہ بنو عباس کے دور میں بھی جاری رہا چنانچہ بشار ابن برد نے جب یعقوب ابن داؤد اور منصور کی ہجو لکھی تو اس میں بھی یہی تعبیر استعمال کی:

ضاعت خلافتکم یاقوم فالتمسوا خلیفۃ اللہ بین الزق والعود۔

سوچنے کا مقام ہے جب ایک شاعر ہجو کرتا ہے تو بھی خلیفۃ اللہ کی لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس زمانہ کے تمام نامور شعراء جریرؔ، فرزدقؔ، نصیبؔ اور سیکڑوں بڑے مشہور شعراء جب خلیفہ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو اس کو خلیفۃ اللہ خطاب کرتے ہیں۔

یہ اس زمانہ کے لوگوں کے اعتقاد کا صرف ایک نمونہ ہے دین کی بنیادی باتوں کے سلسلہ میں بھی اس حد تک ایمان کمزور ہو چکا تھا۔

لوگوں کے اخلاق و عادات تو اس سے بھی زیادہ خراب تھے۔ ابوالفرج کی کتاب اغانی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ یہ میرے ہاتھ آیا کہ تقریباً اسی اور نوے ہجری سے ۵۰، ۶۰ سال بعد تک جتنے بڑے بڑے گانے بجانے

والے عیاش اور عشرت طلب افراد تھے وہ مدینہ سے تعلق رکھتے تھے یا مکہ سے چنانچہ جب شام میں خلیفہ کا دل اکتا جاتا تھا اور محفل رقص وسرود گرم کرنے کی خواہش مچلنے لگتی تھی تو بہترین قسم کے گانے بجانے والوں کے حاضر کئے جانے کا حکم صادر ہوتا تھا اور فوراً کسی کو مکہ یا مدینہ، جو اس وقت مشہور و معروف گانے بجانے والے مغنیوں اور طبلہ بجانے والوں کا مرکز تھے، روانہ کیا جاتا اور وہ وہاں سے چنیدہ افراد کو ساتھ لے آتا ــــــ بدترین فحاشی اور ہرزہ سرائی کرنے والے شعراء مکہ اور مدینہ میں موجود تھے۔

مرکز وحی والہام اور منبع ایمان و اسلام مرکز فحشا و فساد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہمیں مکہ و مدینہ کے بارے میں ان تلخ حقائق کو بھی جاننا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ائمہ کے حالات زندگی سے متعلق کتب و آثار میں ان تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی گئی ہے۔

مکہ میں ایک عمر ابن ربیعہ نامی شاعر تھا جس کا شمار بدترین عریاں اور فحش نگاروں میں ہوتا تھا۔ البتہ شک نہیں کہ فن شاعری میں اس کو پوری قدرت اور کمال حاصل تھا، اس کی داستان اور اس قسم کے دوسرے شعراء کا کردار ایک نہایت ہی افسوسناک اور شرم انگیز تصویر پیش کرتا ہے خود مقامات طواف طواف ورمی جمرات نیز دیگر مشاہد مقدسہ ان لوگوں کی بیہودہ گوئی اور فسق وفجور کے شاہد ہیں۔ ''مغنی'' میں درج یہ اشعار ـ

بدا الی منها حین جمرّت
و کف خضیب زیّنت ببنان
فو الله ما ادری و ان کنت داریا
بسبع رمین الجمر ام بثمان

اسی دور کی وضعیت و کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک راوی کے الفاظ میں جس وقت عمر ابن ربیعہ مرا ہے پورے مدینہ میں صف ماتم بچھ گئی مدینہ کی گلیوں اور کوچوں سے لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں بلند تھیں۔ جس طرف سے گذریئے نوجوانوں کی ٹولی حلقہ بنائے عمر ابن ربیعہ کی موت پر رنج وغم میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ میں نے ایک کنیز کو دیکھا کہ کسی کام سے چلی جا رہی ہے اور اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہیں گریہ وزاری کرتی ہوئی جب وہ کچھ نوجوانوں کے قریب سے گذری تو انہوں نے سوال کیا: کیوں اس قدر گریہ کر رہی ہو؟ کنیز نے جواب دیا ''اس لئے کہ یہ شخص ہمارے ہاتھ سے چلا گیا'' کسی نے کہا ''غم نہ کرو مکہ میں ایک دوسرا شاعر حارثؔ ابن خالد مخزومی موجود ہے اور وہ بھی عمر ابن ربیعہ کی طرح شعر کہتا ہے'' یہ کہکر اس نے حارثؔ کا ایک شعر سنایا جو جس کو سن کر کنیز نے اپنی آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا ''**الحمد لله الذی لم یخل حرمه** (خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنا حرم خالی نہیں چھوڑا!!)

یہ اہل مدینہ کی اخلاقی کیفیت کا ایک معمولی سا نقشہ تھا۔ اس طرح کی بے شمار داستانیں اور اہالیان مکہ و مدینہ کی شب نشینی کے واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور یہ پست طبقہ کے افراد تک محدود نہیں بلکہ ہر طبقہ کا یہی عالم تھا کہ ایک گدائی کرنے والا فاقہ خور و بدبخت شاعر اور جو کر شعب جو 'طماع' (لالچی) کے نام سے مشہور تھا اس سے لیکر کیا کوچہ و بازار میں پھرنے والے معمولی آدمی اور کیا عیش و

عشرت کی زندگی بسر کرنے والے قریشی نواب زادے سبھی یکساں تھے حتی کہ بعض بنی ہاشم جن کا نام میں یہاں نہیں لینا چاہتا ان کی بھی یہی حالت تھی ۔قریش کی مشہور ومعروف شخصیتوں کی اولادیں کیا مرد اور کیا عورتیں عیاشوں، فاسقوں اور فاجروں کی صف میں شامل تھیں ۔یہی شخص حارث بن خالد کی گورنری کے زمانہ میں ایک دن عائشہ بنت طلحہ طواف میں مصروف تھی چونکہ یہ شخص اس سے خاص تعلق رکھتا تھا، جب اذان کا وقت ہوا عائشہ نے حارث کے پاس پیغام بھجوایا کہ کہدو کہ جب تک میرا طواف تمام نہ ہو اذان نہ دی جائے حارث نے حکم دیدیا کہ عصر کی اذان نہ دی جائے لوگوں نے اعتراض کیا کہ تم ایک شخص کے طواف کی خاطر چاہتے ہو کہ لوگوں کی نماز میں تاخیر ہوجائے ؟ تو حارث جواب دیتا ہے: ''بخدا اگر کل صبح تک بھی اس کا طواف طول کھینچتا تو میں یہی کہتا کہ اذان نہ دی جائے۔''!!

سیاسی بدعنوانیاں:- اس فکری اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ہی ساتھ یہ دور سیاسی بدعنوانیوں سے بھی دوچار تھا اور اس کا بھی دینی احکام سے بے اعتنائی میں بڑا دخل تھا۔ زیادہ تر بڑی بڑی شخصیتیں اپنی مادی خواہشات کی تکمیل کے لئے حکومت کے سر برآوردہ افراد کی ڈیوڑھیوں پر سلامی دیا کرتی تھیں ۔محمد بن شہاب زہری جیسی بزرگ شخصیت جو ایک وقت امام سجادؑ کے شاگردوں میں داخل تھی اپنے آپ کو اس پستی میں گرا چکی تھی کہ امام چہارمؑ کو وہ مشہور ومعروف خط لکھنا پڑا جو صرف ایک خط ہی نہیں بلکہ ان حقائق کی بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ اس نے کس قسم کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا کر رکھا تھا اور محمد بن شہاب جیسے افراد کی کمی نہیں تھی۔

علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ نے جو بات ابن ابی الحدید سے نقل کی ہے اس کو پڑھ کر انسانی ذہن کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ بحارالانوار میں علامہ مجلسیؒ نے اولاً جناب جابرؓ کی زبانی امام سجادؑ کا ایک قول نقل کیا ہے امامؑ فرماتے ہیں: **ماندری کیف نضع بالناس ، ان حدثنا هم بما سمعنا من رسول اللّٰه ضحکوا** (فقط یہ کہ حدیث رسولؐ کو قبول نہیں کرتے بلکہ ہنس کر مذاق اڑاتے ہیں) **وان سکتنالم یسعنا**

اس کے بعد علامہ ایک ماجرا نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ لوگوں کے درمیان حدیث نقل کر رہے ہیں کہ مجمع کے درمیان سے ایک شخص اٹھ کر مذاق اڑاتا ہے اور حدیث قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔واقعہ نقل کرنے کے بعد علامہ مجلسی زہریؔ اور سعید ابن مسیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ منحرفین میں سے تھے۔(اگرچہ میں ذاتی طور پر سعید ابن مسیب کے سلسلہ میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیوں کہ دوسری دلیلوں سے آپ کا امام علیہ السلام کے حواریین میں سے ہونا ثابت ہے البتہ زہریؔ کے سلسلہ میں یہ بات صحیح ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے افراد پر یہ بات صادق آتی ہے) جیسا کہ اس کے بعد خود علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ:''ابن ابی الحدید نے ایسی بہت سی شخصیتوں اور اس دور کے رجال (معزز ہستیوں) کا نام ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سب اہلبیتؑ سے منحرف تھے اور پھر آپ حضرت سجادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا:''**مابمکة والمدینة عشرون رجلاًیحبوننا**'' پورے مکہ اور مدینہ میں ایسے بیس

آدمی بھی نہیں ہیں جو ہم کو دوست رکھتے ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام ایسے بدترین حالات میں زندگی بسر کررہے تھے اور یہی وہ دور ہے جب آپ اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کرتے ہیں اور اسی زمانہ کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں: ''ارتدّ الناس بعد الحسین الا ثلاثۃ'' ''امام حسینؑ کے بعد تین افراد کے علاوہ سبھی لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ اور ان تینوں آدمیوں کا نام لیتے ہیں: ابو الخالد الکابلی، یحیٰ ابن ام الطویل اور جبیر بن مطعم (البتہ علامہ شوستری کا خیال ہے کہ جبیر بن مطعم کے بجائے حکیم ابن جبیر ابن مطعم ہونا چاہیے۔ بعض نقلوں میں محمد ابن جبیر ابن مطعم درج ہے۔ بحار کی ایک روایت میں چار افراد کے نام ملتے ہیں جبکہ بعض روایتوں میں پانچ اشخاص کے نام لئے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ قابل جمع ہیں) اتنے سخت ماحول اور ایسی سنگلاخ وادی میں رہتے ہوئے امامؑ اپنے ہدف کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں۔

ہر طرف ہے روشنی شبیرؑ سے

قائم مہدی نقوی تذہیبؔ نگروری

زندگی ہے دین کی شبیر سے	خیر کی ہے روشنی شبیر سے
پاکے دولت عزم و استقلال کی	کتنا ہے خوش ہے آدمی شبیر سے
موت سے گھبرا رہا تھا حر بہت	زندگانی مانگ لی شبیر سے
عہد حیوانی کو مایوسی کے بیچ	آدمیت مل گئی شبیر سے
آفتاب علم و حکمت بن گیا	منبر پیغمبری شبیر سے
حر کو آزادی کا سورج کر دیا	سیکھو! بندہ پروری شبیر سے
ہر بلندی دست بستہ ہے کھڑی	مانگتی ہے زندگی شبیر سے
شادمانی میں توازن کے لئے	غم کی دولت مل گئی شبیر سے
آج بھی دانشوران دہر کو	ملتی ہے دیدہ وری شبیر سے
ہو رہی ہے پردۂ تحریک میں	وقت کی صورت گری شبیر سے
دیکھئے حق و صداقت کا کمال	ہر طرف ہے روشنی شبیر سے
نوع انساں کو حیات جاوداں	مل رہی ہے آج بھی شبیر سے
کتنی مالامال ہے غم کے طفیل	اپنی اردو شاعری شبیر سے
کیوں کرے تذہیبؔ اب جنت کی بات	اس کو جنت مل گئی شبیر سے

امام حسین علیہ السلام کی بین الاقوامی شخصیت

حکیم الامت علامۂ ہندی مولانا سید احمد نقوی مجتہد طاب ثراہ

تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو عالم کا کوئی مذہب ایسا نہ ہوگا جس میں زندگی کے ہر شعبے میں خوبیوں اور بھلائیوں کی تعلیم نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ ہر مذہب کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسان سدھار کرے اور انسانیت کے شرف وعزت کو بڑھائے۔ خود ساختہ حکماء کے مذاہب ہوں، ان کی بھی یہی غرض ہوتی ہے کہ انسان کے ہر شعبۂ زندگی کو بلند و بالا رکھے۔ اور جو الہامی مذاہب خدا کی طرف سے ہیں ان کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ بے شک ان کے جملہ قوانین اس مالک کل رب العالمین کے بنائے ہوئے ہیں جو منصف و عادل، حکیم وعلیم، رحیم وکریم ہے۔ ان میں بدی کا شائبہ ممکن نہیں ہے۔ پھر جب قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی قوم بغیر نبی ورسول نہیں چھوڑی گئی ہے تو ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے مذاہب عالم میں اختلاف ہو اور یک رنگی نہ ہو۔ مذاہب کی کہنگی اور ان کے ماننے والوں کی ایجادیں مذاہب کے اصلی رنگ وروپ کو بدل کر مسخ کر دیتی ہیں اور اس کے اختلاف کو مٹانے کے واسطے وقتاً فوقتاً انبیاء اور رسل آتے ہیں (قرآن) یہ اتحاد مذاہب خود بتاتا ہے کہ جملہ مذاہب میں ایسی باتیں موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور حقیقی تعلیمات کو دہراتی رہتی ہیں۔ خاتم النبیین نے تمام اہل کتاب کو اسی بات کی پر زور دعوت دی تھی کہ ''ہم تم ان باتوں میں مل جل جائیں جو ہم میں اور تم میں برابر سے ہیں اور یہ کہ عبادت خدا میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں'' (قرآن مجید)

مذاہب عالم نے اس دعوت کو آج قبول کر لیا ہے تمام مذاہب توحید الٰہی پر متحد ومتفق ہیں اور اسی بارے میں مرکزیت پیدا ہو چکی ہے۔ محوری ڈکٹیٹر تقریروں میں اسی ایک خدا کا سہارا قائم کر رہے ہیں۔ جمہوریتیں بھی، بودھ مت بھی ہندومت بھی، سکھ صاحبان بھی، برہمن سماج، آریہ سماج، صوفی، ہتیا صوفی، عیسائی، موسائی، مسلمان سبھی توحید کا پرچار کر رہے ہیں کسی نہ کسی شکل سے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کلمۂ جامعہ وتوحید پر ایک دوسرے سے بغلگیر نہ ہو جائیں اور فروعی نزاعوں کی خلیج کو متحدہ کوششوں سے پاٹ نہ دیں۔ جس سے قرآن ورسول کا منشاء پورا ہو۔ اسی کے سب سے پہلے رسول کے نواسے امام حسین نے رہنمائی کی اور اپنی عظیم ترین قربانی کو بین الاقوامی بنا دیا۔ کیوں نہ مذاہب عالم ٹھنڈے دلوں اپنا اور بیگانہ کہنا چھوڑ کر حسینی کارناموں کی تنقید وتبصرے اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے کر کے حسین کو اپنا نہ بنالیں اور ان کی معصومانہ شہادت کو اپنی مذہبی نمائندگی نہ قرار دیں۔

دیکھو سہتیا رتھ پرکاش سلانس ۸۵ :-

''پاپی انسان دھرم کی راہ چھوڑ کر دروغ گوئی، فریب، پاکھنڈ سے مال کو لے کر اور بڑھتا ہے بعد ازاں دولت وغیرہ مال ومتاع، خورد ونوش و پوشاک وزیور سواری،

مکان ،عزت و رتبہ کو حاصل کرتا ہے ۔ بے انصافی سے دشمنوں کو بھی فتح کرتا ہے پھر جلد تباہ ہو جاتا ہے۔''

اس تباہی کی وجہ رگ وید است ادھیائے ۳ ورگ ۸ ا منتر ۲ میں دیکھو'' میں بدکردار ظالموں کو بھی اشیر باد نہیں دیتا'' پھر رگ وید ادی بھاشا بھومکا میں ہے ''میں پرمیشور اس راج میں جہاں دھرم کی پابندی ہوتی ہے قائم ہوتا ہوں ۔جس ملک میں علم و دھرم کی ترقی واشاعت ہوتی ہے وہ میرا مقام مالوف ہے۔''

معلوم ہوا کہ جہاں علم و دھرم کی پابندی نہ ہو خدا اس ملک کو چھوڑ دیتا ہے جس کا تباہ و برباد ہو جانا لازمی ہے۔ اب تاتاریوں میں ترب کی راجدھانیوں کی اس حالت کو دیکھو جو اپنے ظلم وستم ،خونخواریوں ، بے علمی و جہالت و بے شرمی ، بیحیائی ، بے دھرمی میں خونخوار درندوں کے مانند ہوگئی تھی، اس وقت انسانیت کے ہیرو فرزند رسول حسینؑ شہید کی اتنی بڑی قربانی کی ضرورت ہندومت کے اصول پر کتنی ضروری ہوگئی تھی اور پرمیشور کے اشیر باد کی کس قدر مستحق تھی۔

گوتم رشی ایک فاختہ کی جان بچانے کے لیے اپنی گردن پیش کرتے ہیں ۔کیا ان کے زمانے میں یہی ہو رہا تھا کہ مظلوم میثم تمار کے دست و پا کاٹے جائیں اور زبان کاٹ کر اس لئے سولی دی جائے کہ وہ داماد رسول علی ابن ابی طالب کی مدح وتوصیف کرتے تھے؟ کیا گوتم رشی کے زمانے میں یہ بھی ہو رہا تھا کہ جناب محمد بن ابی بکر رسول خدا کے سالے اور خلیفہ کے بیٹے کو گدھے کی کھال میں لپیٹ کر جلا دیا جائے اور اس لئے کہ وہ خلیفۂ وقت علی مرتضیٰ کے پیرو اور پروردہ تھے۔ جناب رشید کے شکم کو چاک کر کے پتھر بھر کر اس لئے شہید کیا جائے کہ وہ دوست علی تھے۔ فرزند رسول امام حسن کو باوجود حکومت سے دستبردار ہونے کے اس لئے زہر دیا جائے کہ علی و بتول کے لاڈلے تھے۔ ایسے راج کے متعلق بودھ مت ایسے پاپیوں کی نسبت کیا حسین کا ساتھ نہ دے گی اور ان کی سنگت کو اپنے اپنے دھرموں کے مطابق فرض انسانی قرار نہ دیں گے۔

ہندومت کی جان اہنسا ہے۔ کیا وہ حسینی اہنسا کی کوئی عملی مثال پیش کرتے ہیں ۔ انصاف سے دیکھو نانا کی وفات پر ان کی اکلوتی بیٹی کو باپ کی جدائی پر رونے سے روکا جاتا ہے۔ حسین کے باپ بھائی کنبہ والوں کو محتاج کر کے بھوکوں مارا جاتا ہے۔ حسین کے بھائی کو زہر دے کر مارا جاتا ہے اور نانا رسول کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیتے، لاش پر تیر برساتے ہیں ۔ پھر حسین کو خاموش قبر رسول پر بیٹھنے نہیں دیتے ۔حکومت کا مطالبہ ہے کہ بیعت کرو یا سر دو۔ حسین مدینہ چھوڑ کر کعبہ میں پناہ لیتے ہیں ۔ کربلا پہونچ کر نہر فرات کے کنارے خیمے گاڑتے ہیں، پھر خیمے اکھاڑے جاتے ہیں عورتوں ، بچوں ،سواری کے جانوروں پر تین روز تک کھانا پانی بند کیا جاتا ہے ۔ پھر بہتر پیاسوں پر ہزاروں یزیدی ٹوٹ پڑتے ہیں، چھ مہینہ کے بچے تک کو زندہ نہیں چھوڑتے ، بیک وقت دل ہلانے والے مصائب کے پہاڑ اس مظلوم پر ڈھائے جاتے ہیں اور حسین تشدد کے موقعوں کو چھوڑتے ہوئے صبر واستقلال وتحمل کرتے ہیں ۔ کیا اس اہنسا کی مثال تاریخ پیش کر سکتی ہے؟ استغفر اللہ

کیا حسین اس اہنسا کی بدولت اس ماتم داری کے مستحق نہیں ہیں جو منو جی مہاراج کی منوسمرتی ادھیائے پانچ میں ہیں ''لڑائی کے میدان میں تلوار وغیرہ کے زخم کھا کر جو مر جائے تو اس کا کرما کرم اس وقت ختم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پاکی بھی ختم ہوجاتی ہے مگر غیر ملک میں مرجائے اور دس روزے پورے نہ ہوتے ہوں تو دس دن میں جتنی کمی ہوا تنے دن اس کا ماتم کریں۔''

پھر ادھیائے سات میں ہے ''قابل تعریف لڑنے والوں کا دھرم ہے ،لڑائی کی حالت میں دشمنوں کو مارنا ، کشتری اس دھرم کو نہیں چھوڑتے۔''

امام حسین کی تحفظ انسانیت میں جنگ ،حفاظت دھرم کے لئے جنگ ، انسانیت سوز بداخلاقیوں کی مدافعتی جنگ، بہتر تنوں کی ہزاروں سے تین دن کی بھوک پیاس میں جنگ کرنا اور شہادت کے بعد تین روز تک عرب کی ریگستانی تپتی زمین پر لاشوں کا پڑا رہنا اور کوئی کریا کرم نہ ہونا کیا قابل فخر نہیں ہے۔

ہندو دھرم خود انصاف کرے اگر اس وقت منو جی مہاراج کربلا میں موجود ہوتے تو ان مظلوموں کا کیا دفن و کفن نہ کرتے اور دس دن خود ماتم کرتے یا نہ کرتے۔اس لئے کہ انسانیت کا تقاضا تو یہی تھا۔ پھر ان کے پرستار، ان کو کیا یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس بین الاقوامی انسان کا پہلی محرم سے دس تک ماتم کریں اور حسینی یاد منائیں۔جیسا کہ شریف الخیال انسانیت کے علمبردار اہل ہنود کثرت سے اس وقت بھی حسین مظلوم کی پرخلوص عزاداری کرتے ہیں۔

حسینؑ کی نبوتی شان

توریت، زبور، انجیل، قرآن کو نظر انصاف سے دیکھو۔جس بدکاری، ظلم و بے انصافی و بے دینی کے وقت نبیوں نے بے جگری سے مصیبتوں، تکلیفوں کو برداشت کیا ہے حسین نے بھی اپنے زمانے میں عربوں کی بگڑی ہوئی بدترین حالت کو سدھارنے میں انبیائے سابقین سے زائد ہمت و مردانگی، جابر و ظالم سلطنت کا مقابلہ کرکے اپنی قربانی پیش کی ہے اور انسانیت کے سدھار میں نبیوں کے قدم بقدم چلتے رہے اور وہی رنگ ڈھنگ رہا جو انبیاء کا تھا۔اور کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ حسین وارث انبیاء و مرسلین تھے۔اور وہ سب شرف و فضیلتیں بربنائے توارث عمرانی ذات حسین میں جمع تھیں۔کربلا کے میدان میں اپنے عمل سے جس طرح سے قرآنی تعلیم دے رہے تھے اسی طرح توریت و انجیل و زبور وصحف انبیاء کی تعلیم دے رہے تھے۔اور جملہ انبیاء کی پوری نمائندگی کررہے تھے۔

جب اہل دنیا کے اخلاق بگڑتے ،خدا کے رسول سروں کو ہتھیلیوں پر رکھے سامنے آجاتے تھے۔حسین نے بھی وہی کیا۔اور ٹھیک موقع پر کیا حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ظلم فرعون سے بچا کر بنی اسرائیل کو نکال لائے۔حسین کا کیا یہ کم کارنامہ ہے کہ اپنی شہادت سے کروڑوں بندگان خدا کو یزیدیت سے بچا لیا؟ جناب عیسیٰؑ کا نصاریٰ کی نظر میں سب سے بڑا کام سولی پر چڑھنا تھا۔ انصاف کرو حسین نے تنہا نہیں بہتر تنوں سے جن میں چھ مہینہ کا بچہ بھی ہے، راہ خدا میں قربانی دیدی۔اس لئے کوئی

بقیہ صفحہ ۴۴ر پر

علی کرم اللہ وجہہ

ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب طاب ثراہ

اسلامی نظریہ کے مطابق جب سے اس زمین پر انسان کے قدم آئے اور عام خیالات کی بنا پر جب سے انسانی حافظہ نے واقعات کو تاریخی حیثیت دی اس وقت سے اس وقت تک بہت سے افراد نے خاص طور سے شہرت حاصل کی۔ ان یادگار ہستیوں کی شہرت کو جب گذشتہ دور جہالت کی تاریکی مٹا نہ سکی تو قیاسی نتیجہ یہی ہے کہ آئندہ یہ دور تاریخی بھی مٹا نہ سکے گا اور قیام قیامت تک ان ہستیوں کی یاد کسی نہ کسی صورت سے باقی رہے گی۔ شہرت کے ذرائع یقینا اکثر ذاتوں میں مختلف ہوا کیے۔ کوئی اپنے بغض وحسد میں مشہور ہوا جیسے شیطان اور کوئی اپنے خلوص ومحبت سے شہرت عام کا مستحق قرار پایا جیسے حضرت آدمؑ۔ کسی نے گمراہی میں شہرت حاصل کی جیسے فرعون اور نمرود اور کسی نے دیانتداری اور ایمانداری میں نام پیدا کیا جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ۔ کوئی دنیا پرستی میں یادگاریں چھوڑ گیا اور کوئی دین پرستی میں آج تک شہرۂ آفاق ہے۔ جس طرح اچھائیاں جب حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں تو انسان اپنے ذکر خیر کے ساتھ اس ناپائیدار دنیا میں ہمیشہ یاد کئے جانے کا استحقاق پیدا کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی کی برائیاں انتہا کو پہنچ جائیں تو نفرت وحقارت ہی کے ساتھ سہی مگر اس کا تذکرہ پائیدار ہو جاتا ہے دور سابق کی ہستیوں میں تو وہ لوگ بھی ہیں جن کا نام برائیوں، بدکرداریوں اور گمراہیوں کے ذریعہ نقش کالحجر بن کر اس وقت تک صفحۂ عالم پر موجود ہے مگر ان کی تعداد بہ نسبت ان لوگوں کے کم ہے جو اپنے ایمان، حسن اخلاق، نیک سیرت، فضائل ذاتی کے اعتبار سے مشہور عالم ہیں۔ ان ہستیوں میں سب بڑی تعداد ان انسانوں کی ہے جو کسی مذہب کے بانی یا مبلغ یا راہبر قرار پائے۔ اس وقت میرا نقطۂ نظر اس نزاع کا تصفیہ نہیں ہے کہ مذہب کی بنیاد رکھنے والوں یا دینی رہبروں میں کون حقیقی اور کون سچا اور کون چھوٹا تھا اگر یہ بحث چھیڑ دوں تو شاید میرے مضمون کا سلسلۂ کئی دن تک ختم نہ ہوگا اور بحث ومباحثہ وتنقید کا ایک لا متناہی باب ایسا کھل جائے گا جو قیامت تک ختم نہ ہوگا اس لئے میں اس وقت ایک مشہور عالم ہستی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا نام نیک آج تک ہر مسلمان اور ہر اس انسان کے دل پر نقش ہے جس نے کبھی تاریخ اسلام پر نظر ڈالی ہو۔

یقینا تمام وہ انبیاء ومرسلین، ان کے نائب پائدار اور مستقل شہرت کے مستحق ہوئے جن کے نام کتب سماوی توریت وزبور وانجیل وقرآن میں موجود ہیں اور یقینا ان میں کی ہر ہستی تمام بہترین کردار اور حسن اخلاق سے مزین تھی۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان تمام ہستیوں میں سر سبد فضائل کوئی ایک ہی صفت ہی رہی۔ کسی کو ملک کا سجدہ کرنا

تمام مخلوقات عالم میں ممتاز کر گیا تو کسی کا سفینہ دنیا کو غرق کردینے والے طوفانی موجوں سے مقابلہ میں آج تک مشہور عالم ہے، کوئی آگ کو گلزار کردینے سے شہرت حاصل کر گیا تو کوئی فرعونیت کے مقابلہ سے مستحق مدح وثنا ہوا، کسی نے جہاد میں شہرت حاصل کی تو کسی نے امن وصلح اور زہد و عبادت کے نقش دلوں پر جما دیئے، کوئی اپنی مظلومی اور صبر میں یاد رکھنے کا قابل ہوا تو کوئی اطاعت خالق میں بچے کے گلے پر چھری رکھ دینے سے عزم واستقلال کی اس بلند منزل پر پہنچا جہاں سابقین میں کسی اور کی رسائی نہ ہوئی لیکن تمام مشہور عالم ہستیوں میں دو چچازاد بھائی، خسر و داماد، نبی ووصی یعنی محمد عربی وعلی ہاشمی ان تمام فضائل، حسبی ونسبی، ذاتی وصفاتی، دنیوی اور دینی میں ایسی بلندیوں پر پہنچے جہاں دشمن تو دشمن دوستوں کی نگاہ تلاش بھی حد بندیوں کا کوئی دائرہ قائم نہ کرسکی۔ دونوں قدرت خالق کے کمالات کا آئینہ، دونوں علم وحکمت باری کے مظہر، دونوں انسانیت کی اعلیٰ فرد، دونوں تمام اخلاق حسن کے جامع، دونوں ملکیت کے اعلیٰ افراد سے بھی بلند تر، دونوں نسل ابراہیمی کا شرف دونوں عربی، قریشی، ہاشمی مطلبی، دونوں اصول اربعہ اخلاق وحکمت وعفت وشجاعت و عدالت کے مظہر اتم بلکہ سرچشمہ اور منبع۔ ترجیح بلا مرجح عدل باری کے خلاف ہے اس لیے یہ ماننا ہر انصاف پسند انسان کے واسطے ناگریز ہے کہ جس کو قدرت نے نبوت و رسالت سے ممتاز کیا اس میں یقینا کچھ صفات سبب ترجیح ضرور تھے جس کی وجہ سے ایک رسول اور دوسرا وصی رسول ہوا مگر انصاف پسند دل اقرار کریں گے کہ جس کو وصی قرار دیا وہ بھی تمام فضائل نفسانی اور کمالات روحانی میں بعد محمد مصطفیٰؐ بے مثل و بے نظیر تھا۔ عربوں کی جو صفتیں قابل مدح تھیں، قریش کے جو فضائل لائق تعریف تھے، ہاشم کی سرداری، عظمت، سخاوت جو مشہور عالم تھی، عبد المطلب کا انداز حکومت، طرز دیانت، معاملہ فہمی، صلح پسندی جن میں آپ تمام بنی ہاشم میں ممتاز تھے۔

ماں باپ دونوں کی طرف سے پہلے پہل علی اور ان کے بھائی ہی ان کے وارث ہوئے اور ان تمام صفات کے ساتھ ہی ساتھ وقت ولادت ہی سے ایمانداری، زہد و تقویٰ، علم ومعرفت، معاملہ فہمی، ذہانت، ذکاوت، عالی ہمتی، بلند نگاہی، بہادری اور شجاعت، عفت وعصمت، عدالت و حکمت، زہد وعبادت، کرم وسخاوت، بے غرضی و بے نفسی، سیاست اور اصابت رائے میں اتنے بلند تر مرتبوں تک پہنچے جہاں کوئی اور نہ پہنچ سکا۔ کسی ایک دو یا تین چار صفتوں میں کامل ہونا ہی وہ منزل ہے جہاں شاذ ونادر انسان بمشکل پہنچ سکے۔ چہ جائیکہ تمام صفات فضائل کا جامع ہونا بعد رسول عملیؐ پر ختم ہو گیا یا پھر ان کی معصوم اولاد کی میراث میں آیا۔ تمام مسلمان اس ذات عالی کو کرم اللہ وجہہ کا مستحق مانتے ہیں اور یہ مانتے ہوئے اس بلند نگاہی کی تصدیق کردیتے ہیں کہ وقت ولادت ہی علیؑ کو معرفت الٰہی کا کمال حاصل تھا۔ بچپنا ہر انسان کم عقلی ونافہمی ہی میں گزارتا ہے اگر ماں باپ ایماندار ہوں تو بچہ ہر عمل میں ماں باپ کی کچھ نہ کچھ پیروی کرتا ہے اگر گمراہ ہوں تو گمراہی میں ابوین کی تعلیم کا اثر لیتا ہے ہمارا تو مسلم الثبوت عقیدہ ہے کہ نبی وعلی کے والدین بلکہ جہاں

انوار طیبہ رہے وہ سب بطن وصلب طیب و طاہر تھے۔مگر اس میں تو شک نہیں کہ ان دونوں بزرگواروں کا کنبہ وقبیلہ ہم قوم وہم وطن معاشرے میں تمام وہ لوگ جو برابر سے شریک کار تھے، گمراہی وبداخلاقی،ظلم وشرک میں مبتلا تھے اور عام مسلمانوں کے خیالات کے مطابق ان دونوں بزرگواروں کے والدین بھی صحیح مذہب کے پیرو نہ تھے بہرحال جو کچھ بھی ہو اس ماحول میں بچپنا گزارنا اور کرم اللہ وجہہ کا مستحق ہونا، کسی گمراہی کی طرف وقت ولادت سے آخر عمر تک مائل نہ ہونا،ظلم وشرک، گمراہی اور بداخلاقی سے دامن پاک رکھنا، بس یہی ایک صفت علی کی پوری سوانح عمری کو بے داغ، بے عیب،کمال علم ومعرفت،حقیقت شناسی،معاملہ فہمی،عصمت و عفت کا ایسا زبردست ثبوت ہے کہ جس کے بعد کسی دلیل کی تنقیح وتنقید کی ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ ہر انصاف پسند کو ماننا پڑے گا کہ جو قبل بلوغ اور بچپنے کی ابتدائی گھڑیوں میں کبھی کسی غلطی میں مبتلا نہ ہوا اس عالم میں کہ جب جناب ابراہیمؑ کے سے افضل انبیاء و مرسلین نے ستاروں کو بار بار ھٰذا ربی کہہ کر بعض لوگوں کو العیاذ باللہ آپ کے کفر وشرک کا مدعی بنا دیا علی نے دھوکا کھانے والوں کو بھی ایسی بدگمانیوں کا بھی موقع نہ دیا تو ظاہری بلوغ وکمال عقل و علم کے بعد یہ شبہہ کرنا یقیناً بڑے سے بڑا ظلم اور بڑی سے بڑی غلطی ہے کہ علیؑ نے کوئی غلط دعویٰ کیا،کسی بات میں غلطی کی،کبھی جھوٹ میں بولے، یا خودغرضی سے،خود پرستی سے یا خاندان پرستی سے کام لیا۔

میں اس ذات کی مدح وستائش کیا کرسکتا ہوں جس کے یہاں فضائل میں یوم فتح خیبر رسول اکرمؐ بھی یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ ''اگر مجھ کو یہ شبہہ نہ ہوتا کہ لوگ ویسا ہی کچھ علی کے بارے میں بھی کہیں گے جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم کے واسطے کہا تو آج میں کچھ علیؑ کے فضائل بیان کرتا'' گویا رسول کا مقصد یہ تھا کہ ؎

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

تو میں ایسی ذات کے فضائل کیا بیان کرسکتا ہوں۔میرا نقطۂ نگاہ مدح علیؑ میں ایک ہی نقطہ ہے یعنی کرم اللہ وجہہ۔خدا نے علیؑ کے چہرے کو بزرگ رکھا،کبھی بت کے سامنے پیشانی خم نہ ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک جملہ میں علیؑ کی سبقت اسلام،کمال ایمان،کمال معرفت الٰہی،حقیقت شناسی،حق کی پیروی، جھوٹ اور کذب سے پرہیز،شوق عبادت، خالق جرأت وشجاعت یعنی جن کی عبادت میں تمام عرب کے ضدی ہٹ دھرم،شجاع اور بہادر سرخم ہوئے تھے ان کے سجدے سے بالا علان اور یوں اظہار کے ساتھ انکار کہ عالم انسانیت اس انکار کا شاہد ہوجائے ۔غرض تمام صفات وفضائل اس جملہ سے ظاہر ہیں جس کے بعد کسی توضیح وتشریح کی ضرورت نہیں۔اس جملہ کا صرف آپ کی ذات سے مخصوص ہوجانا آپ کی سبقت اسلام ، معرفت ، علم وعصمت میں تمام اولین وآخرین سے برتر اور افضل تر ہونے کی دلیل اور اقرار صحیح ہے۔

۱۔تمہارا بہترین دوست وہ ہے جو تمہاری غلطیوں پر تم کو متوجہ کرے اور نیک کام کی طرف راغب کرے۔(رسول اکرمؐ)
۲۔بچوں کے جو حقوق ماں باپ پر ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ان کا خوبصورت نام رکھیں اور ان کی صحیح تربیت کریں۔(رسول اکرمؐ)

وسیلۂ فیوض و برکات الٰہی

آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی طاب ثراہ

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاھرین المعصومین خصوصاً علیٰ بقیۃ اللہ فی خلقہ و حجۃ علی ارضہ امین وحیہ و عیبۃ علمہ الذی ببقائہ بقیۃ الدنیا و بیمنہ رزق الوریٰ سید نا مولانا حجۃ بن الحسن السلام التام علیہ و علیٰ آبائہ الکرام۔

شعبان کا بابرکت مہینہ اتنا محترم ہے کہ خاتم النبیین و سید المرسلین نے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ رمضان خدا کا مہینہ ہے اور شعبان میرا مہینہ ہے ۔ اس مہینے کی تیسری تاریخ کو ہمارے تیسرے امام جگر گوشۂ سید المرسلین مصداق ذبح عظیم حضرت ابوعبداللہ الحسینؑ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اور وسط ماہ شب پانزدہم ماہ شعبان وہ بابرکت رات ہے کہ جس میں نور اللہ فی السموات و الارضین امام عصرؑ کے وجود ذی جود سے دنیا روشن و منور ہوئی ہے۔ **اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد**

اس میں کوئی شک نہیں کہ کارخانۂ عالم اللہ ہی کے اشارے پر چل رہا ہے ۔ لیکن سنت الٰہی یہ قرار پائی ہے کہ اس نے اپنی صفات کمال کے ظہور کے لئے اسباب و ذرائع مقرر فرمائے ہیں ۔ نظام کائنات ملائکہ کے ذریعہ قائم ہے جیسا کہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے: **والمدبرات امرا** مجھے قسم ہے (ان ملائکہ کی) جو امر الٰہی کی تدبیر کرتے ہیں ۔ عالم غیب و ملکوت سے اشرف المخلوقات انسان کے لئے جن ذوات کو رابطہ قرار دیا گیا ہے وہ ملائکہ کی بہ نسبت زیادہ باشرف ذاتیں ہیں جن کا لقب خلیفۃ اللہ قرار پایا ہے۔

جب تخلیق انسانی سے ارادۂ الٰہی متعلق ہوا تو سب سے پہلے اسی رابطہ کا جناب آدمؑ کی شکل میں تقرر فرمایا گیا۔ اس خلافت الٰہی کا سلسلہ ہر دور میں انبیاء و مرسلین اور اوصیائے انبیاء کے ذریعہ قائم رہا۔ یہاں تک کہ ارحم الراحمین نے اپنی رحمانیت و رحیمیت کے مظہر تام رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مبعوث برسالت فرمایا۔ سرکار رسالت کی ذات تمام عالم کے لئے اللہ کی صفت رحمٰن کا مظہر بھی تھی اور مومنین کے لیے خاص طور پر رحیمیت کا مظہر بھی تھی ۔ جیسا کہ قرآن مجید نے رسولؐ کی صفت **بالمومنین رؤف رحیم** فرمائی ہے ۔ رسولؐ کے بعد اللہ کے فیوض و برکات کا سلسلہ ختم ہو جائے اور اللہ اپنی صفات رحمانیت و رحیمیت کے ظہور کا وسیلہ کسی کو قرار نہ دے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جبکہ رسولؐ اکرم مختلف مواقع پر اس کا اعلان بھی فرماتے رہے ہیں کہ میرے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ کبھی حدیث ثقلین میں ارشاد ہوتا ہے تم میں دو گراں قیمت چیزیں چھوڑے جاتا

ہوں ایک خدا کی کتاب دوسری میری عترت واہلبیت ہیں جب تک ان دونوں سے وابستہ رہوگے کبھی گمراہ نہ ہوگے اور یہ کہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں۔ کبھی حدیث نجوم میں ارشاد ہوا ''جس طرح ستارے اہل آسمان کے لیے امان ہیں اسی طرح میرے اہلبیتؑ زمین کے لوگوں کے لیے امان ہیں ان میں جب بھی کوئی ستارہ نگاہوں سے غائب ہوتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ طلوع کرتا رہتا ہے۔'' حدیث شریف کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ تمام نظام سماوات ستاروں کی جذب و کشش پر قائم ہے اگر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے تو عالم بالا میں ابتری پھیل جائے اسی طرح زمین کا نظام اہلبیت علیہم السلام میں سے کسی نہ کسی فرد کے وجود پر موقوف ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اور بھی متعدد روایات اہل اسلام کی معتبر کتابوں میں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم انسانیت میں غیبی فیوض و برکات کا ذریعہ خاتم النبیینؐ کے بعد آپ کی ذریت طاہرہ ہے جن کی کوئی نہ کوئی فرد قیامت تک قائم رہے گی۔ قرآن مجید کا مشہور سورہ انا انزلناہ بھی اس کا شاہد ہے ممکن ہے کہ اس سورہ کی تلاوت کی تاکید اور کثرت ثواب کی روایات اسی بنا پر ہوں کہ اس سورہ سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ملائکہ رحمت کے نزول کا مرکز ہے اور ہمیشہ زمین پر موجود رہے گی۔ ہمیں چاہئے کہ اس سے اپنا روحانی رابطہ قائم رکھیں۔ سورہ کی ابتدا میں ارشاد ہے ''ہم نے قرآن

کو شب قدر میں نازل کیا'' نزول قرآن کا ذکر صیغۂ ماضی میں کیا گیا، یعنی وہ ایک معینہ شب تھی جس میں قرآن قلب رسالت یا پہلے آسمان پر نازل ہوا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ رات بس ایک مرتبہ نزول قرآن کے موقع پر آئی اور ختم ہوگئی بلکہ شب قدر کے تعارف میں ارشاد ہوا ''تنزل الملائکۃ و الروح'' ملائکہ اور روح کا نزول اس شب میں ہوتا رہتا ہے۔ ماضی کا صیغہ نہیں بلکہ مضارع کا صیغہ وہ بھی نزول نہیں 'تنزیل' سے۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ شب قدر برابر آتی رہے گی اور نزول ملائکہ کا سلسلہ قائم رہے گا جو تحفۂ درود وسلام کے ساتھ زمین پر اترتے رہیں گے اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسالت مآبؐ کے بعد بھی کوئی ایسی ذات ہے جو تمام عالم کے لیے اللہ کی رحمانیت اور خاص طور پر مومنین کے لیے رحیمیت کا مظہر بن کر الٰہی فیوض و برکات کا وسیلہ ہے۔ یہی وہ ذات ہے جو خلیفۃ اللہ فی الارض، رسالت مآبؐ کی نائب، تمام عالم کے لئے امن وسلامتی کا ذریعہ جس کے لئے **ببقائہ بقیۃ الدنیا و بیمنہ رز ق الوریٰ** کہنا درست ہے۔ خداوند عالم ہم سب وابستگان دامان خاندان رسالت کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنے اعمال و کردار سے اس سریر آرائے سلطنت امامت و نیابت رسولؐ کی خوشنودی حاصل کر کے ان کی دعاؤں کے مستحق قرار پائیں۔

امام حسین علیہ السلام:

❁ جس طرح تمہیں اپنے اوپر ظلم پسند نہیں دوسروں پر ظلم مت کرو۔

❁ انسان کی عزت اس میں ہے کہ وہ دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

مسئلہ امامت

معین الشریعہ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب

شیعوں کے نزدیک ہر دور اور ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے معین کردہ کسی نہ کسی معصوم کا وجود ضروری ہے جو دین کا محافظ ہو، لوگوں کو احکام شرعیہ اور عقائد دینیہ کی تعلیم دے، دین میں تحریف کرنے والوں اور اختلاف پیدا کرنے والوں سے دین کی حفاظت کرے اور اختلاف کی صورت میں صحیح تعلیمات سے لوگوں کو باخبر کرے۔

یہ سلسلہ خاتم النبیین تک انبیاء و مرسلین کی صورت میں قائم رہا۔ ان میں سے کچھ صاحب شریعت تھے جو الٰہی پیغام بندوں تک پہنچاتے تھے اور کچھ شریعتوں کے محافظ تھے پہلے صاحب شریعت پیغمبر جناب نوح اور آخری خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ تھے۔ آپ کی ذات پر دین کامل اور نبوت تمام ہوگئی۔ اب نہ کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ کوئی نبی آئے گا۔ لیکن جس طرح دو صاحب شریعت پیغمبروں کے درمیان حفاظت شریعت کے لیے انبیاء کا تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا رہا۔ اسی طرح سے رسالتمآبؐ کے بعد آپ کی ذریت میں سے کچھ بلند مرتبہ افراد کو یکے بعد دیگرے خداوند عالم نے حفاظت وصیانت اسلام کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ جن کا کام دین کی حقیقی تعبیر سے لوگوں کو واقف کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ جن کا تعارف رسالتمآبؐ نے کبھی تفصیلاً اور کبھی اجمالاً اپنی احادیث کے ذریعہ سے فرمایا اور ہر امام اپنے بعد والے امام کو پہچنواتا رہا۔ اس سلسلہ کے پہلے امام علی بن طالب تھے اور آخری وہی امام مہدیؑ ہیں جن کی آمد کی پیشین گوئی رسالتمآب اپنی متفق علیہ احادیث میں فرماتے رہے ہیں جو اس وقت ظہور فرمائیں گے جب زمین ظلم و جور سے مملو ہو چکی ہوگی۔ (پہلی صدی ہجری سے تقریباً ہر صدی میں مہدویت کے دعویدار پائے جانا یا بعض اشخاص کے مہدی ہونے کا عقیدہ اور ان دعویداروں کے مخالفین کا اصل عقیدہ مہدویت کو رد نہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ ہر دور میں یہ عقیدہ کہ ایک ایسا شخص جس کا لقب مہدی ہوگا اور جو عدل و انصاف کو عام کرے گا اجماعی اور مسلمات اسلام میں سے ہے) یہ آخری نائب رسول عدل و انصاف کو عام کریں گے۔ ان کے پرچم تلے پوری دنیا توحید و رسالت کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجائے گی۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں کوئی دین باقی نہیں رہے گا۔ یہ خلاصہ ہے ان پیشین گوئیوں کا جو تمام مسلمانوں میں مسلم ہیں۔ ابھی چند سال پہلے موتمر اسلامی کے لجنۂ فقہیہ کا یہ فتویٰ منظر عام پر آچکا ہے کہ مہدی موعود کا جو نسل فاطمہ سے ہوں گے عقیدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ احادیث صحیحہ اس بارے میں موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔

اہلسنت اور شیعوں کی احادیث اس باب میں بھی متفق ہیں کہ اسی زمانہ میں جناب عیسیٰؑ بھی ظہور فرمائیں گے اور یہ اولوالعزم پیغمبر اسی نائب رسولؐ کے پیچھے نماز پڑھے گا۔

چونکہ یہ ائمہ اہلبیتؑ اس رسولؐ کے نائب ہیں جو

سید المرسلین اور اشرف النبیین ہے جس پر آیۂ کریمہ ''اذ اخذ اللّٰہ میثاق النبیین'' کی ایک تفسیر کی بنا پر تمام گذشتہ انبیاء سے ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا۔ اسی کامل دین اور آخری شریعت کے محافظ ہیں، جو گذشتہ تمام شریعتوں سے افضل و بہتر ہے لہٰذا ان کا مرتبہ گذشتہ انبیاء سے بلند ہے۔ (جیسا کہ جناب عیسیٰؑ کے آخری امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے پتہ چلتا ہے)

رسالتمآبؐ کی متفق اور متواتر حدیث ''**انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اهلبیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلو بعدی و انهما لن یفترقا حتی یردئ علی الحوض**'' میں تم میں دو گراں مایہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک خدا کی کتاب دوسرے میرے اہلبیت۔ جب تک ان دونوں سے وابستہ رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں'' ان سے وابستگی کو نجات کی شرط قرار دیتی ہے۔

انہی اہلبیت کے بارے میں رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے **مثل اهلبیتی کمثل سفینة نوح من رکبها نجیٰ و من تخلف عنها غرق و هویٰ** میرے اہلبیت کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے جو بھی اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے بھی اس سے کنارہ کشی کی وہ غرق اور ہلاک ہوا یعنی جس طرح ہلاکت سے نجات سفینۂ نوح میں منحصر تھی اسی طرح صرف وہی نجات حاصل کر سکیں گے جو اہلبیت سے تمسک رکھیں گے۔

یہ احادیث اتنی مشہور ہیں کہ کسی بھی صاحب بصیرت کے لئے انکار مشکل ہے لہٰذا حوالوں کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ اگر زیادہ تحقیق منظور ہو تو عبقات الانوار ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

قطعات

مولوی سید محمد رضا نقوی

مزے جنت کے دنیا پا رہی ہے
گھٹا رحمت کی ہر سو چھا رہی ہے
مہک اٹھے نہ کیوں بزم حسینی
گل زہراؑ کی خوشبو آ رہی ہے

بولئے، کس لال کو خوش، کس کو رنجیدہ کریں
دو محق، اک بچۂ آہو، پیمبرؐ کیا کریں
لیجئے، بچہ لئے آتی ہے ہرنی بدحواس
یہ کہاں ممکن حسینؑ اور راستہ دیکھا کریں

رضاؔ جائسی

ضیائے چشم حیدرؑ، فاطمہؑ کے نور عین آئے
جہاں کیوں کر نہ ہو پر نور شاہ مشرقین آئے
چمک کر کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ یہ مدینے کا
مبارک ہو مبارک ہو حسینؑ آئے حسینؑ آئے

قیام دیں کے لئے ہر خوشی حسین نے دی
طلب کی حق نے جو نعمت، وہی حسین نے دی
تھا ایک پیکر بے روح قالب اسلام
گلا کٹا کے اسے زندگی حسین نے دی

کیا کیا جائے؟

خطیب انقلاب مولانا حسن ظفر نقوی جائسی (کراچی)

ہمارا سفر طویل، صبر آزما اور تھکا دینے والا ہے!
ہمارے سامنے مسائل کا انبار ہے! مہیب اور گمبھیر مسائل۔
بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے یہ مسائل اچانک ہی ہماری قوم پر آپڑے ہیں جس کے لیے لوگ پہلے سے تیار نہ تھے اور نہ ان حالات کا سامنا کرنے کے لیے کوئی پیشگی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مشکلات اور مسائل کی جڑیں کم ازکم ایک صدی پیچھے پیوست نظر آتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب ان مسائل اور مشکلات کے بیج بوئے جارہے تھے اور استعمار بڑی ہی ہوشیاری اور چابک دستی سے ہندوستان کی سرزمین پر نہ ختم ہونے والے فتنہ وفساد کی داغ بیل ڈال رہا تھا اور بنیادیں مضبوط کر رہا تھا اسی وقت سے اس فتنہ وفساد کی جڑیں کاٹنے کے لیے منصوبہ بندی ہونا چاہیے تھی مگر لاشعوری طور پر مذہبی قوتیں سامراجی عزائم کو کامیاب کرنے کا باعث بنتی چلی گئیں۔

سامراج تقسیم در تقسیم کے اصول پر عمل پیرا رہا اور یہ عمل صرف سرحدوں کی تقسیم پر نہیں رکا بلکہ تقسیم شدہ زمینوں میں علاقائیت، لسانیت اور فرقہ واریت کے روپ میں پروان چڑھتا رہا اور آج ایک مضبوط اور تناور درخت کی صورت میں اس خطے پر اپنے منحوس اور شیطانی سائے کی ظلمتیں پھیلاتا چلا جارہا ہے اور اس سرزمین کا کوئی بھی گلی کوچہ ایسا نہیں ہے جہاں اس شجر خبیثہ کی کوئی شاخ سایہ فگن نہ ہو اور اسے اپنے آسیب سے متاثر نہ کر رہی ہو۔

موجودہ حالات نے فکر وعمل کی صلاحیتوں کو سلب کرلیا ہے، بدترین حالات اتنی مہلت ہی نہیں دے رہے کہ ملت کو اس بحران سے نکالنے کے لیے منصوبہ بندی کی جائے جو کام بھی کیا جارہا ہے وہ ایڈہاک اور عبوری بنیادوں پر کیا جا رہا ہے، لہٰذا مستقل و پائیدار نتیجے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمیں کچھ دیر کے لئے اپنے دل و دماغ کو یکجا و یکسو کرنا ہوگا، کچھ وقت کے لئے حالات کی دلدل اور خوش فہمیوں کی جنت سے اپنے آپ کو باہر نکالنا ہوگا، عبوری فیصلے کرنے کے بجائے بڑے صبر وتحمل سے ازسرنو اپنی صفیں درست کرنی ہوں گی بلکہ یہ مان کر کہ صفیں ہیں ہی نہیں اپنے سامنے ایک صفر لگانا ہوگا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے صبح وشام بدلتے حالات ہمیں مسائل میں کود جانے کے لیے پکاریں گے، لوگوں کی فریادیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کریں گی، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم نہ صرف یہ کہ ایک منتشر معاشرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ ان حالات میں کود کر کچھ کر سکنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو سکتے ہیں!!

اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔ قومیں چند سالوں میں بنتی یا بگڑتی نہیں ہیں۔ تاریخ اقوام یہی بتاتی ہے کہ یہ

صدیوں کا عمل ہے۔ سینکڑوں سال ظلم وستم کی چکی میں پسنے والی قوم بالآخر survive کرتی ہے اور آخر کار ایک قوت کی صورت میں ابھرتی ہے۔ صدیوں تک دنیا کے بڑے بڑے حصے پر حکمرانی کرنے والی قومیں آخر کار تاریخ کے پہیے میں آکر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کسی خاص قوم کی مثال دینے کی ضرورت نہیں تاریخ کے صفحات پر بے شمار مثالیں ثبت ہیں۔

ہمارے ایک گروہ کو بالآخر یہ ذمہ داری لینا پڑے گی کہ وہ بظاہر اپنے اوپر بے حسی طاری کر لے اور کسی بھی طرح حالات کے موجودہ دھارے سے اپنے آپ کو باہر نکالے اور اپنے لئے ایک پناہ گاہ تلاش کر لے۔ یہ پناہ گاہ اپنی جانیں بچانے کیلئے نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے ''غار حرا'' کا کام دے۔

ایسی ہی ایک پناہ سب سے پہلے عبدالمطلبؑ نے فتنہ وفساد سے دوری اختیار کر کے حاصل کی اور اس فکری پناہ گاہ میں برسوں تک اپنی قوم کی حالت پر کف افسوس ملنے کے ساتھ ساتھ دل ودماغ کے دریچے کھول کر قوم کے مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ یہ فکر عبدالمطلبؑ صرف غار تک محدود نہ رہی بلکہ جب یہ غار سے باہر نکلی تو عبدالمطلبؑ اپنے بیٹوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا تربیت یافتہ گروہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے جو آنے والے کل میں ابوطالبؑ، عباسؑ، حمزہؑ اور ان کی اولادوں کی صورت میں نقیب انقلاب کو قوت فراہم کریں گے اور برسوں پر محیط عبدالمطلبؑ اور ابوطالبؑ کی زحمتیں رنگ لا کر رہیں گی اور جب وہ منجی بشریتؐ فتنہ وفساد کے شجر خبیثہ کی جڑوں پر حملہ کرے گا تو پروردگار اسے حیدر کرارؑ کی شکل میں اپنے ضیغم کی نعمت عطا کرے گا۔

اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود کچھ اقدامات کیے جائیں۔ پہلے خود اپنے حالات بدلنے کے لیے قدم بڑھائے جائیں۔ لیکن از حد ضروری ہے کہ یہ غور وفکر کرنے والا گروہ، غار حرا تلاش کرنے والا گروہ مخلوق خدا کی محبت سے سرشار ہو، خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہو عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہو اور میخانۂ کربلا کا جام پیئے ہوئے ہو جس کا کبھی نہ اترنے والا خمار اسے جادۂ حق پر گامزن رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

ایسے افراد کی تلاش اور انہیں یکجا کرنا مشکل ترین مرحلہ ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ ایسے افراد کسی خاص طبقے میں نہیں بلکہ ہر طبقے میں موجود ہیں اور ان کا ہر طبقے میں نفوذ ضروری ہے۔ تلخ ماضی یہ بتاتا ہے کہ مختلف طبقات کو نظر انداز کرنے کے بھیانک نتائج سامنے آئے۔

دانشور طبقہ کسی بھی قوم کے ارتقا میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادیب، شاعر، طبیب، قانون داں، معلم، فلسفی وغیرہ یہ سب مل کر کسی معاشرے اور قوم کی تشکیل اور ترقی میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گزشتہ نصف صدی پر نظر ڈالیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان کی فکری صلاحیتوں کو ملت کی تعمیر کے بجائے سربراہان وقت کی خدمات کے لئے وقف کر دیا گیا اور جو اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر تیار نہ ہوا اس کی آواز اس کے گلے ہی میں گھونٹ

دی گئی یا اتنی نحیف کر دی گئی کہ خود اسے بھی اپنی آواز اجنبی محسوس ہونے لگی۔

آغاز کیسے کیا جائے؟

مسائل کی نشاندہی بہت آسان مگر ان کا قابل عمل حل پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ جب تک ہم مسائل کی جڑ کو نہ تلاش کر لیں ہم ان پر قابو پانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب تک اپنے دشمن کی شناخت حاصل نہ کر لیں اسے شکست دینے کا خیال بھی احمقانہ ہے۔ ہمارا اصل دشمن وہ نہیں ہوتا جو ہم پر گولی چلاتا ہے یا ہماری بستیوں کو تاراج کرتا ہے بلکہ اصل دشمن وہ ہوتا ہے جو اس سے گولی چلوا رہا ہوتا ہے اور آگ لگوا رہا ہوتا ہے۔

دشمن کی شناخت:-

بس جد و جہد کی راہ پر قدم بڑھانے سے پہلے ہمارے لئے دشمن کو پہچاننا اور اس کے متعلق تمام معلومات کا حاصل کرنا ضروری ہے، درپیش حالات میں انسانیت کو جہنم کی طرف ڈھکیلنے والے شیطان کے یہ آلہ کار تہہ در تہہ پردوں اور نقابوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کو جہنم کے دہانے تک پہنچانے کے لئے سامراج نے کچھ عفریتوں کو ہم پر مسلط کیا اور ظلم تو یہ ہے کہ ان سانپوں بلکہ اژدہوں کو ہمارے ہی ہاتھوں دودھ پلوایا اور بظاہر ہم خود ہی ان کے طاقتور اور آگ برسانے والے اژدہا بنانے کا موجب بنے۔

پہلا عفریت: فرعونیت کے وارث جاگیردار، جو زمین پر ربوبیت کے دعویدار بن کر اپنے آپ کو انسانیت کے دائرے سے خارج کرنا اور انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا اپنا حق سمجھتے ہیں، زمین جتنا بھی سونا اگلے وہ ان کی ملکیت اور ان کے شہزادوں اور شہزادیوں کے روز و شب کو رنگین تر بنانے کے لئے یا پھر ایوان اقتدار کی غلام گردشوں کو صاف رکھنے کے لئے وقف ہے تاکہ ان کی جاگیروں پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں پر جن کے خون پسینے سے یہ زمین سونا اگلتی ہے اپنے رعب وجلال کا سکہ بٹھایا جا سکے اور جب یہ فرعون اعلان کریں کہ ''انا ربکم الاعلیٰ'' تو یہ کیڑے مکوڑے نما مخلوق ان کے سامنے سجدے میں چلی جائے۔

یہ جاگیردار دراصل سامراج کی غلامی کے صلے میں حاصل کی ہوئی جاگیروں کے مالک ہی نہیں بلکہ اس کے تمام شیطانی ہتھکنڈوں کے وارث بھی ہیں۔ یقیناً ان میں کچھ افراد اپنے ہی سسٹم کے باغی ہوتے ہیں مگر یا تو وہ گمنامی میں زندگی بسر کر دیتے ہیں یا پھر اپنے ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں کیونکہ اپنی جاگیرداری کی حفاظت کرنے والے اپنے سسٹم کے لئے کوئی خطرہ برداشت نہیں کر سکتے، چاہے وہ خونی رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا عفریت: ہامانی بیوروکریسی جو اللہ کی مخلوق پر فرعونوں کو مسلط کرنے کی ذمہ دار ہے۔ فرعون بدلتے رہتے ہیں مگر یہ اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ انہیں اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کا فن آتا ہے۔ حکمرانوں کے لئے زندہ باد اور ان کی مخالفت کرنے والوں کے لئے مردہ باد کے نعرے لگانے والے سادہ عوام یہ نہیں جانتے کہ عوام کا خون

چوسنے والی عفریت دراصل بیوکریسی ہے جو حکمرانوں کو یہ باور کراتی ہے کہ ان سے زیادہ حکومت کا وفادار کوئی نہیں ہے اسی خونخوار بیوکریسی کی سامراج نواز پالیسیوں پر حکمران عملدرآمد کرتے ہوئے بے چارے اور بے کس عوام پر قہر ڈھاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بیوروکریٹس عوام کے سامنے مظلوم بن جاتے ہیں کہ وہ قصوروار نہیں ہیں بلکہ وہ تو حکمرانوں کے احکام کا اجرا کر رہے ہیں۔

کرپشن پھیلانے میں سب سے زیادہ ہاتھ اسی بیوروکریسی کا ہوتا ہے۔ غیر ملکی قرضے لینے اور ہڑپ کرنے کے یہ ماہر افراد جب تک حکمران طبقے میں کرپشن پیدا نہ کر دیں اس وقت تک یہ خود اپنے خزانوں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے پہلے یہ خود حکمران خاندان اور وزیروں مشیروں کو کرپشن کے راستے سجھاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس کی چند وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو وہ شیطانی نظام ہے جو سامراج ہمارے سر تھوپ گیا ہے۔ اس نظام میں بیوروکریسی ان ہی کی تربیت یافتہ، ان ہی کے خطوط پر تربیت حاصل کرنے والی ہے جو اپنی سرزمین اور اور اپنی قوم سے زیادہ اپنا ناطہ انگریزوں سے جوڑنے کو فخر جانتی ہے، ان کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، بچوں کی انگریزی آیاؤں کی گود میں تربیت، چھٹیاں یورپ کے حسین ساحلوں پر گزارنا، مصیبت میں ملک چھوڑ کر فرار ہونے کے لئے ہر وقت پر تولے تیار رہنا ہے۔ دوسری وجہ بے دینی ہے یہ ان کی تربیت کا خاصہ ہے کہ ان کا کوئی دین نہیں ہوتا، ان کا دین، مذہب، عقیدہ سب ان کی کرسی اور ان کا مفاد ہوتا ہے اسی لئے یہ اپنے ملک کے بجائے استعماری طاقتوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ اپنے عوام کا خون پانی کی طرح بہہ جائے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن اگر ان کے آقاؤں کی مثلاً امریکہ یا برطانیہ کے سفارت خانوں یا ان کے ملازمین کو کوئی چھوٹی دھمکی بھی دی جائے تو پھر آپ ان کی فکرمندی اور پریشانی دیکھئے۔ اصل میں یہ ان ہی ملکوں کے سفارت خانوں کے وفادار اور نمک خوار ہیں۔

یقینا ان میں استثنائی افراد مل جائیں گے جو نہایت خلوص اور جذبہ خدمت کے ساتھ اور اس نظام کو بدل دینے کی آرزو کے ساتھ تربیت حاصل کر کے اس سسٹم میں داخل ہوتے ہیں لیکن انہیں جلد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس شیطانی چکر میں آ چکے ہیں۔ مگر ایسے مخلص افراد کی تعداد اتنی ہوگی جتنی پولیس کے محکمے میں ایماندار افراد کی بلکہ شاید پولیس میں زیادہ فرض شناس افراد مل جائیں گے مگر بیوروکریسی جو تہہ در تہہ پردوں میں چھپ کر کام کرتی ہے انمیں یہ تعداد شاید اس سے بھی کم ہو۔

تیسرا عفریت:- جرائم پیشہ سیاست دان:

اسمگلروں، چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور لٹیرے سرمایہ داروں کی بہترین پناہ گاہ سیاسی جماعتیں ہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ یہ جرائم پیشہ افراد سیاسی افراد اور سیاسی جماعتوں کو فنڈز فراہم کرتے تھے تاکہ برے وقت میں یہ سیاسی جماعتیں ان کی سرپرستی کریں یا برسر اقتدار آ کر انہیں لوٹ مار کرنے میں مزید مراعات فراہم کریں مگر اب

یہ سارے جرائم پیشہ افراد خود ہی سیاستدانوں کے روپ میں آکر سیاسی جماعتوں میں شمولیت یا نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے ذریعے اپنے مجرمانہ کاروبار کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اسکی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں، ہیروئن کا کاروبار ہو یا اسلحہ کا ٹیکس چوری اور کسٹم ڈیوٹی بچانے کا مسئلہ ہو یا بینکوں کا قرضہ ہڑپ کرنے کا، ایجنسیوں کے حصول کا مسئلہ ہو یا بڑے بڑے ٹھیکوں کا، سب جگہ ان کا راج ہے اور پورے ملک میں ہر شعبے میں ان کا شیطانی رقص جاری ہے۔

وقتی طور پر ہی سہی لیکن جب ایک چوروں کا ٹولہ جاتا ہے اور دسرا چوروں کا گروہ اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے تو پچھلے والوں کے کارنامے ضرور سامنے آتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سارے چور کسی مشترکہ مفاد پر ہم آواز ہوجاتے ہیں۔

یہاں بھی کچھ مخلص اور شریف افراد کو استثنائی گروہ میں شامل کرنا پڑے گا مگر اس شیطانی نظام میں ان سے کسی معجزے کی توقع فضول ہے۔

چوتھا عفریت :- اسلام سے ناآشنا اسلام کے ٹھیکیدار مُلّا:

جہاں تاریخ اسلام وارثان انبیا یعنی علمائے حق کی قربانیوں سے پر ہے اور ان کے پاک خون سے منور ہے وہیں ہر دور میں علماء کا لبادہ اوڑھ کر اسلام پر شب خون مارنے والے نام نہاد ملاؤں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو کسی خاص مکتب کے نہیں بلکہ ہر مکتب فکر میں موجود رہے ہیں اور اس تحریر میں میرا اشارہ انہیں دین فروشوں کی طرف ہے نہ کہ ان علمائے حق کی طرف کہ جو اسلام کی پیشانی کا جگمگاتا ہوا جھومر ہیں اور جن کے قلم کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے لیکن ان دوسری قسم کے نام نہاد ملاؤں کے خلاف بھی بات کرنا، ان کے خلاف قلم اٹھانا، ان کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھانا، کاسۂ سر اپنے ہاتھ میں اٹھانے کے مترادف ہے اگر لوگوں کے سامنے ان کا حقیقی روپ پیش کرنے کے عوض سر دینا پڑتا ہے تو سودا مہنگا نہیں ہے۔ ان جعلی ملاؤں میں اور قرآن کریم میں پیش کئے جانے والے یہود و نصاریٰ کے احبار اور رہبانیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ بھی آیات الٰہی کا سودا بڑے سستے داموں میں کرتے ہیں۔ دین کی طرف مڑنے کے بجائے دین کو اپنی جانب موڑتے ہیں یہ جس اسلام کے دعویدار ہیں اس میں سلامتی ہی نہیں ہے باقی سب کچھ ہے۔

یہ جو اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسلام پھیلایا یہ مسلک پھیلاتے ہیں، منجی بشریتؐ نے جاہل، متعصب اور وحشی لوگوں کو انسان بنایا اور یہ انسانوں کو واپس جہالت، تعصب اور وحشت و بربریت کے راستے پر لئے جا رہے ہیں، رسولؐ بدترین دشمنوں پر بھی قابو پانے کے بعد روز فتح مکہ شہر میں رحمت اور شفقت بن کر داخل ہوتا ہے، یہ جہاں جاتے ہیں خونریزی اور تاراجی کی داستانیں رقم کرتے ہیں۔ رسول عربیؐ نے مساجد کو فلاح کی دعوت دینے کے لئے تعمیر کرایا، یہ قتل و غارت گری کی دعوت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اپنے مذہبی مقام کو

معاشرے میں محبت کی شیرینی پھیلانے کے بجائے زہر پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ زہریلے انسان ہیں جن سے سانپ اور بچھو بھی پناہ مانگتے ہیں۔ لوگوں کو تقویٰ و پرہیز گاری کا درس دینے والے یہ لوگ خود مادہ پرستی اور خواہشات نفسانی کی پیروی میں سب لوگوں سے آگے ہیں۔

مساجد پر قبضے کا مسئلہ ہو یا مدارس کی آڑ میں زمین گھیرنے کا معاملہ یہ ان جرائم پیشہ سیاستدانوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ کیونکہ سیاستدان جو کچھ کرتے ہیں دین کی آڑ میں نہیں کرتے مگر یہ دین کے ٹھیکیدار وہی سارے کام دین کا لبادہ اوڑھ کر انجام دیتے ہیں اور عوام الناس کو علمائے باعمل سے بھی بدظن کر دیتے ہیں۔

لوگوں کو خمس و زکوٰۃ کے معاملے میں خدا سے ڈرانے والے یہ لوگ کتنی آزادی سے خمس و زکوٰۃ ہڑپ کر جاتے ہیں وہ ان کے اور ان کی اولادوں کے طرز زندگی سے ظاہر ہے۔ سرمایہ داروں کے لئے مسند بچھاتے ہیں، جاگیرداروں کے خوشامدی اور چاپلوسی، سیٹھوں کے سامنے سراپا التجا اور اگر کوئی ضرورت مند، مسکین محتاج بھولے سے ان کے در پر چلا جائے تو پھر دیکھئے اس غریب کی کتنی توہین ہوتی ہے۔

یہی مادی خواہشات انہیں شیطانی طاقتوں کا آلہ کار بنا دیتی ہیں۔ مدارس کی مالی امداد کی آڑ میں یہ قوتیں ان میں نفوذ پیدا کرتی ہیں یہ مال کی چکا چوند سے اندھے ہو کر اپنے دین و ضمیر دونوں کا سودا کر لیتے ہیں، مال دینے والوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں اور انسانی بستیوں کی بربادی کے لئے خون آشام بھیڑیئے بن جاتے ہیں۔ اور ایسے میں لوگوں کو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ صحیح اور غلط علماء کو کیسے پہچانیں؟

ہمارے مکتب میں تو خدا کا شکر ہے کہ صورت حال بہت بہتر ہے مگر دوسری جگہوں پر تو یہ عالم ہے کہ افلاس زدہ، بھوک و غربت کے ستائے ہوئے ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑے ان کے حوالے کر دیتے ہیں کہ کم از کم بھوکے تو نہیں مریں گے۔ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے یہ بچے خیرات اور صدقات کے مال پر پروان چڑھنے والے یہی معصوم بچے جب ہر جمعرات اپنے ٹھیکیدار، مدرسے کے مالک ملا کے حکم پر محلے کے گھر گھر جا کر کھانا مانگ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت سے ان کے ذہن میں اس معاشرے سے انتقام لینے کا لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ (یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ بین الاقوامی میڈیا نے بھی ان کی یہی منظر کشی کی ہے)

احساس کمتری کے شکار یہ معصوم بچے یکا یک وحشی درندوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور جن دروازوں پر انہیں ایک ایک وقت کی روٹی کے لئے جانا پڑتا تھا، ان دروازوں میں جنازے رکھوا دیتے ہیں، ان گھروں میں صف ماتم بچھوا دیتے ہیں۔ (خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مدارس کم از کم اس معاملے میں دوسرے مکاتیب سے بہت اچھے ہیں)

یاد رہے کہ میں ہر مکتب کے اسلام نا آشنا ملاؤں کی بات کر رہا ہوں ان علماء کی بات نہیں کر رہا ہوں جو دوسروں کا خون بہانے کے بجائے اپنے ہی خون جگر کو روشنائی بنا کر اسلام کی تاریخ درج کرتے ہیں اور ہر دور میں سامراج اور اس کے گماشتوں کے لئے چیلنج بن جاتے ہیں،

نہ دین کا سودا کرتے ہیں نہ ضمیر کا، جنہوں نے جوانوں کو اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے خود سولی پر چڑھنا گوارا کرلیا۔

گزشتہ ایک صدی کا ہی مطالعہ کریں گے تو آپ کو جمال الدین افغانی سے لے کر لبنان کے عباس موسوی تک مبارز علماء کی ایک طویل فہرست مل جائے گی جو اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے آخری سانس تک سامراج کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن ان مجاہد علماء کو بھی ان کے مقاصد حاصل کرنے کے دوران ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے سے روکنے میں جہاں سامراجی طاقتوں کا ہاتھ تھا۔ وہیں ان اسلام نا آشنا اور فرقہ پرست ملاؤں کا بھی ہاتھ تھا۔ جو سامراج کو بھی ظل الٰہی قرار دینے سے نہیں چوکتے اور انہیں اولی الامر قرار دے کر ان کی اطاعت کو واجب گردانتے تھے۔ تاریخ ہند کے مطالعے کے دوران آپ کو کچھ مکاتب کے علماء کے ایسے فتوے مل جائیں گے جن میں انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف قیام کو حرام قرار دیا تھا۔

اگر عارف حسینیؒ اور ان کے مثل علماء نے جام شہادت نوش کیا تو اس لئے کہ اسلام نا آشنا ملاؤں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے عمل کے ذریعے استعمار اور اس کے آلہ کاروں کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم عارف حسینیؒ کی میراث کو اس طرح لوٹیں گے کہ آئندہ طویل عرصے تک عارف حسینیوں کا راستہ بند ہو جائے گا۔

جوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے لئے نمونۂ عمل عارف حسینی اور ان کے جیسے علماء ہونے چاہئیں۔ انہیں فرقہ واریت پھیلانے والے کچھ دین فروش اور ضمیر فروش ملاؤں کی حرکتوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دنیا پرستوں کا وہ ٹولہ ہے جو دین کے مقدس لباس کی آڑ میں اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کر رہا ہے اور اس فعل پر بہت خوش ہے کہ کس طرح لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ مقدس اور متبرک ناموں پر ''سپاہ'' اور ''جیش'' ترتیب دیئے جارہے ہیں تاکہ اسلام کے نام پر ہی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔

بقیہ امام حسین علیہ السلام۔۔۔

یہودی، نصرانی نہیں کہہ سکتا کہ حسین نے ان کے اصول و آئین کی پوری پوری نمائندگی نہیں کی۔ اسی لئے اس شہادت عظمیٰ پر نبیوں نے خود ماتم کیا اور امتوں کو ماتم کا حکم دیا۔ (دیکھو ہماری کتاب نبیوں کا ماتم) اس موقع پر صرف یرمیاہ نبی (باب ۴۶ آیت ۱۰) کی پیشین گوئی سن لو۔

''کیونکہ خدا رب الافواج کے لئے اتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہوا ہے۔''

حسین کے سوا فرات کے کنارے کون ذبیحہ خدا کی راہ میں گزرا۔ اسی جرم پر جو اہل دنیا کی نظر میں جرم تھا۔ یعنی حکومتوں نے جو اپنے لئے خدائی اختیارات سمجھ لئے تھے اس کی مزاحمت کرتے تھے اور حیوانیت مٹا کر انسانیت کی رہبری کرتے تھے۔

گذشتہ سے پیوستہ

ظلم کو روکنے کے لئے معجزہ کیوں نہیں......؟

حجۃ الاسلام عبد العظیم المہتدی البحرانی

ترجمہ: مولانا نثار احمد زین پوری صاحب

معجزہ کسی چیز کا بدل نہیں ہوسکتا

نیکیوں یا برائیوں کی طرف بڑھنے میں انسان کی کوشش کا دخل ہے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ تمام مشقتیں اور تکالیف برداشت کر لیتا ہے مومن کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے اس سے جدو جہد اور کوشش طلب کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے اور غیر مومنوں کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں ہے کیونکہ روز قیامت جب مومنین جنت میں اور معاندین جہنم میں داخل ہوں گے۔ سعی وعمل خدا کی عدالت کا معیار ہوگی۔ اگر اس کے لئے بھی خدا معجزہ پیدا کر دیتا اس سے مومنین کا کردار اور صلاحیت ناکارہ ہوجاتی اور دوسری طرف معاندین کو خدا کی عدالت پر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا۔

یہ اعتقاد کہ اخیار کے جہاد کے بغیر خدا معجزہ کے ذریعہ اشرار کو ناکام کرتا ہے غلط اعتقاد ہے اور قرآن و حدیث سیرت نبویؐ اور زندگانی اہل بیتؑ کی سیرت اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اس غلط عقیدہ سے دین کا ہر حکم بے کار ہے۔ پھر جنت وجہنم کا کوئی فلسفہ نہیں رہ جاتا اور نہ خلقت انسان کی کوئی حکمت باقی رہتی ہے اور نہ ہی لوگوں کی طرف انبیاء بھیجنے اور حلال وحرام بیان کرنے کی کوئی علت رہتی ہے۔

یہ کیونکر صحیح ہے کہ مسلمان بغیر مشقت اٹھائے یہ تمنا کرے کہ اس کی حیات سے مشکلات دور ہو جائیں جبکہ خدا نے ان مشکلات کو دفع کرنے کے لئے عقل، دین اور ارادہ کی قوت عطا کی ہے اور وسائل کی تسخیرات کے لئے اعضاء وجوارح عطا کئے ہیں؟!

اور کسی مجاہد کے لئے یہ کیسے صحیح ہے کہ وہ یہ تمنا کرے کہ اس کے جنگجو دشمن کے سر پر، منصوبہ سازی، قوت کی جمع آوری اور آپسی اتحاد کے بغیر چھت گر پڑے اور اس چھت گر پڑنے سے دنیا میں وہ مدح وثنا کا اور آخرت میں بہترین جزا کا مستحق قرار پائے؟!

اس حقیقت سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کی عدالت مومنین اور غیر مومنین سب کے لئے ہے، غیر مومنین نہ دنیا میں اعتراض کر سکتے ہیں اور نہ آخرت میں جہنم میں جاتے وقت احتجاج کر سکتے ہیں۔

مسلمانو!

اسلام اس لئے نہیں آیا ہے کہ وہ اپنے اتباع

کرنے والوں کو خیال بافی اور ناز ونخرے کا عادی بنائے۔

مثال کے طور پر جب آپ اپنے بچے کو ناز ونعم میں پرورش کریں گے اور اس کے ہر چھوٹے چھوٹے مطالبہ کو پورا کریں گے، اسے کوشش نہیں کرنے دیں گے تاکہ وہ جد وجہد کرے اور اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرے تو آپ نے اس پر ظلم کیا اور اس کے مستقبل کو برباد کر دیا، شاید دلی طور پر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ عیش و آرام میں پرورش پانے والا یہ بچہ جب بڑا ہوگا تو اس وقت وہ مشکلات کو برداشت نہیں کر سکے گا اور نہ ہی یہ ارادہ اور کامیابی حاصل کرنے کے سلسلہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی لذت محسوس کر سکے گا اور اسی طرح یہ اس شخص جیسا لطف بھی نہیں اٹھا پائے گا جو زندگی کی سختیوں سے حیات کا لطف اٹھانے کی خاطر جنگ کرتا ہے۔

ایسے شخص کو کہ جس کو آپ نے مقابلہ بازی اور اقدار کی لذت سے محروم کیا ہے، یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ آپ پر لعنت و ملامت کرے کیونکہ آپ نے اس سے روح اعتماد کو چھینا ہے اور اس کی خود اعتمادی کو سلب کیا ہے۔

جب یہ خیال باف لوگوں کے لحاظ سے یہی طے ہے کہ خدا کو مسلمانوں کے لئے معجزے دکھانا چاہیے اور وہ محلوں میں بیٹھے رہیں، اور ان کے حکام عقلمند ترین حکام، ان کی سیاست کامیاب ترین سیاست، ان کے شہر بہترین شہر، ان کی عمارت بہترین عمارت، صاف ستھرے راستے، مواصلاتی سسٹم، اسپتال، مدارس، یونیورسٹیاں اور مساجد، کارخانے اور فوجی توانائی کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ہوں

کیا یہ مضحکہ خیز خیالات اور جاہلوں جیسی تمنائیں نہیں ہیں؟

بالفرض اگر یہ خیالات پورے بھی ہو گئے تو پھر جنت اور جہنم کا کوئی مفہوم باقی رہتا ہے؟ کیا خدا کی عدالت اور حریت کا کوئی مفہوم باقی بچتا ہے؟

ہمارا پروردگار ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے یہاں تک ان پر بھی ظلم نہیں کرتا جو اس پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

حکمت و عدالت کا تقاضہ یہ ہے کہ کام کرو بلندی پر پہونچو اور اگر زندگی میں مشکلات پیش آتی ہیں تو ان سے بھی بہت سے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں کیونکہ مشکلوں میں ہی انسان اپنے نفس کی قیمت پہچانتا ہے اور سب کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں جنت کا مستحق ہے۔

کیا آپ پڑھائی کے زمانے میں راتوں کو جاگ کر پڑھنے والے اور سکنڈ ڈویژن پاس ہونے والے طلبہ میں فرق محسوس نہیں کرتے کہ کتنی مسرت ہوتی ہے اور دوسرے لوگ اسے کس احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یقیناً وہ اس کا مستحق ہے۔ اسی طرح ہمیں زندگی کے ہر مرحلہ میں سعی و کوشش کرنا چاہیے تاکہ ہم خدا کی رضا اور اس کی ہمیشہ رہنے والی جنت کے مستحق قرار پائیں۔

جب خدا کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے

جب آپ ان حقائق سے واقف ہو گئے اور ان سے آپ کا نفس مطمئن ہو گیا تو اب ہم یہ بتا دیں کہ کچھ ایسے مواقع ہیں جہاں ہمارا پروردگار معجزہ کے ذریعہ

دخل دیتا ہے۔ لیکن معجزہ کو ان واجب کاموں کا عوض قرار نہیں دیتا ہے جو بندوں پر واجب ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ اپنی فکر وخیال کے مطابق معجزہ چاہتے ہیں۔ مثلاً امام رضاؑ کے روضہ میں بم رکھنے والے کے لئے یہ تمنا کرتے ہیں کہ اسی وقت اس کے ہاتھ کٹ جاتے یا وہ اسی جگہ پتھر بن جاتا یا کم از کم وہ بم نہ پھٹتا۔ بعض حضرات یہ سوچتے ہیں کہ حرم امام حسینؑ کو کوئی صدمہ نہ پہونچتا یا حضرت عباسؑ کے حرم کو، گنبد کو کوئی نقصان نہ پہونچتا یا کوئی شخص یہ تمنا کرتا کہ ہے کہ عراق میں عتبات مقدسہ پر ٹینکوں سے حملہ کرنے والا کمانڈر حملہ کرنے سے پہلے ہی خاک ہو جاتا۔

خداوند عالم فرماتا ہے: میں اپنے طریقہ سے معجزہ دکھاتا ہوں نہ کہ تمنا کرنے والے کا ہل تیرے طریقہ سے!

مثلاً کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت کے بعد خدا نے چاہا کہ مختار ثقفی۔ جو کہ ابن زیاد کی قید سے رہا ہوئے ہیں۔ کا انقلاب بپا ہو چنانچہ مختار نے مجرموں اور قاتلوں سے انتقام لینے کے لئے تلوار کھینچ لی اور امام حسینؑ کے قتل کا حکم دینے والے ابن زیاد کا سر قلم کر دیا اور پھر ابن زیاد کے مددگاروں کو چن چن کر مارا سب سے پہلے فوج کے سپہ سالار عمر بن سعد کو بنت رسولؐ کے بیٹے حضرت حسینؑ کا سر قلم کرنے والے شمر ذی الجوشن کو گرفتار کیا اور اسے اسی طریقہ سے قتل کیا جس طرح اس نے حسینؑ اور بنی ہاشم کے مظلوم جوانوں کو قتل کیا تھا۔

راوی کہتا ہے: میں مدینۂ رسولؐ میں داخل ہوا اور امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھ سے کوفہ کے حالات معلوم کئے میں نے کہا: وہاں سے چلتے وقت مجھے کوئی خاص خبر نہیں ملی تھی۔ فرمایا: کیا حرملہ بن کاہل اسدی ابھی تک زندہ ہے؟!۔ حرملہ علی اصغرؑ کا قاتل ہے جب بچہ اپنے بابا امام حسینؑ کے ہاتھوں پر پیاس سے تڑپ رہا تھا حرملہ نے تین بھال کا تیر مارا تھا۔

اہل بیتؑ کو جتنا اس فاجعہ کا غم ہوا تھا اتنا کربلا میں رونما ہونے والے کسی حادثہ کا غم نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے امام زین العابدینؑ نے بطور خاص اس خبیث قاتل کے بارے میں سوال کیا۔

راوی کہتا ہے: ہاں فرزند رسولؐ وہ زندہ ہے اور کوفہ کی گلی کوچوں میں گھومتا ہے۔ یہ سن کر امامؑ نے آسمان کی جانب ہاتھ بلند کئے اور دعا کی: اے اللہ آخرت سے پہلے اسے دنیا میں آگ کا مزہ چکھا دے۔

راوی مزید کہتا ہے: ابھی میں واپس کوفہ نہیں پہونچا تھا کہ معلوم ہوا کہ کوفہ میں مختار کا انقلاب کامیاب ہو چکا ہے میں کوفہ میں داخل ہوا وہاں ایک جگہ جم غفیر دیکھا، میں بھی جم غفیر کے پاس پہونچا تو معلوم ہوا کہ مختار نے پیاسے بچے۔ علی اصغرؑ۔ کے قاتل حرملہ کا وہ ہاتھ قطع کر دیا ہے جس سے اس نے تیر مارا تھا پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

میں مختار کے قریب آیا اور اپنے دل میں سوچنے لگا سبحان اللہ! کتنی جلد امام زین العابدینؑ کی دعا مستجاب ہوئی اس کے بعد میں نے مختار سے وہ بات بتائی جس کے بارے میں امامؑ نے مجھ سے سوال کیا تھا اور دعا کی تھی، یہ سن کر مختار

خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑے کہ انہوں نے امامؑ اور آپ کے اہل بیتؑ کے دکھے ہوئے دل کو خوش کیا ہے
کیا یہ عمل معجزہ نہیں ہے۔ معجزہ کا بعض لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ اکثر خواہشیں ایسے تخیلات کی طرف تمایل رکھتی ہیں جو کہ حکمت، بلند مفاہیم، عظیم مقاصد اور سنن الٰہیہ سے خالی ہوتے ہیں۔

یہ بھی تو معجزہ ہی ہے کہ تاریخ بشریت میں لوگوں میں ائمہ کی محبت بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اور اذیتوں، جرائم اور قتل کے باوجود لوگ ان کے عتبات کی طرف بڑھتے ہی جاتے ہیں اور روضۂ امام رضاؑ میں ضریح کے پاس دھماکہ کے بعد عنقریب آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ امام رضاؑ کے زائروں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ (یہ بات میں نے ۱۴۱۵ء میں کہی تھی اور ان برسوں میں زائرین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے میں نے عراق جانے والوں سے سنا ہے کہ عراق کے عتبات مقدسات کے زائرین کی تعداد بھی بڑھی ہے یہ بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کی دلیل ہے کہ ذہنی سکون کا فقدان، زائرین کی ایذا رسانی اور عتبات مقدسہ میں بزدلانہ حرکت سے اہل بیتؑ کے محبوں کا عقیدہ کبھی کمزور نہیں ہوگا۔)

کوئی بشر ائمہ کی اس محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے جو کہ گذشتہ اسلامی صدیوں میں کروڑوں دلوں میں جاگزیں رہی ہے اور انہیں غم و الم کے ساتھ ائمہ کے مرقدوں پر لے گئی ہے۔ چنانچہ وہ ان کی ضریح کے پاس آنسو بہاتے ہیں اور تاحیات ان سے بیعت و محبت کا اعلان کرتے ہیں۔

یہ صورت گذشتہ زمانے کی ہے جبکہ ان کے لئے بہت سے خطرات تھے۔ کیا ائمہؑ سے ان کا یہ لگاؤ اور الفت ایک قسم کا معجزۂ الٰہیہ نہیں ہے؟!

مومنو! ہم سے کس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے

ہمارا عقیدہ ہے خدا مہلت دیتا ہے، بیکار نہیں بناتا اور یہ خدا کی سنت نہیں ہے کہ وہ ارادہ کو سلب کرے اور انسان کی آزادی چھین لے، یہاں تک کہ اس کی آزادی اس وقت بھی نہیں چھینتا جب انسان اپنی آزادی سے خدا کی معصیت کرتا ہے یا کوئی جرم کرتا ہے، ہاں خدا اپنی حجت اس پر تمام کرتا ہے پھر اس سے قصاص لینے کے کا کوئی مناسب وقت مقرر کردیتا ہے۔ مومنوں کو خدا اور اس کے صفات کے بارے میں اس حقیقت کا محکم عقیدہ رکھنا چاہیے اور طمانیت اور تسلیم کے بلند درجات پر پہونچنے کے لئے یقین کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ شیاطین کے وسوسوں اور مغرضوں کے پروپیگنڈوں سے متاثر ہوکر راہ راست سے بھٹک نہ جائیں۔

بے شک اہل بیتؑ کے جو شیعہ، واحد واحد اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور گمراہ کرنے والے فتنوں اور دشواریوں کے زمانے میں زندگی گزارتے ہیں خدا نے ان لوگوں کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے جو اپنے سامنے گمراہیوں کے فتنے دیکھتے ہیں اور ان میں مبتلا ہونے سے ڈرتے ہیں اور کامیابی کے ساتھ ان سے نکل آتے ہیں۔

یہ مت کہو کہ کہاں ہے آسمانی مدد اور کہاں ہیں خدا کے معجزات کہ ان ناصبوں اور ظالموں کو لگام دیں بلکہ یہ کہو کہ وہ خلل و رخنہ کہاں ہے جہاں سے یہ ناصبی اور ظالم تجاوز

کرنے والے آتے ہیں ۔ بس ہمیں اپنے ایمانی ، فکری ، اخلاقی اور اجتماعی اداری اور اقتصادی امور کی اصلاح کرنے کی سوچنا چاہیے ۔ اس کے بعد خدا اپنے صالح بندوں کی معجزات کے ذریعہ مدد کرتا ہے۔

جن لوگوں کے دینی اعتقادات مصائب اور دشمنان اسلام کے پروپیگنڈوں کے وقت متزلزل ہوجاتے ہیں ان سے خدا کہتا ہے : اس کے کیا معنی ہیں : ٹھرو ٹھرو ! احکام صادر کرنے میں جلدی نہ کرو اور نہ منصوبہ سازی میں عجلت کرو ورنہ اس طرح حالات بدتر ہوجائیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ خدا انہیں ایسے ہی آزمائے گا جیسے مجرمین کو لیکن فی الحال تمہارے امتحان کا وقت ہے، جو لوگ امام رضاؑ کے روضہ میں بم رکھتے ہیں تو ایک طرف تو ان کی یہ قتل و غارت گری ان کے اعتقادی اخلاقی اور انسانی تہی دامنی کو ثابت کرتی ہے دوسری طرف خدا بھی ان سے درگذر نہیں کرے گا مگر یہ زمانہ محبو، دوستو! تمہارے امتحان کا ہے۔

پس یہ تمہاری محبت وولا تمہیں امتحان کے مرحلہ سے سلامتی و کامیابی سے گزارتی ہے یا بھڑک اٹھتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں تم شک وشرک کے کیچڑ میں گر پڑو! خدا ہمیں اور تمہیں اس سے محفوظ رکھے۔

لہٰذا میری نظر میں حقیقی بم وہ ہے جو شک کی صورت میں ذہن میں پھٹتا ہے لیکن جو بم مسجدوں اور عتبات مقدسہ میں پھٹتے ہیں وہ تو صرف مجرم اور معاً نیک افراد کا امتحان ہے ، لیکن دونوں کی صورتیں مختلف ہیں ، آپ ذرا سلمان رشدی اور اس جیسے افراد کو دیکھئے مرنے سے پہلے ہی ان کے لئے جہنم تیار ہوگیا سکون کی لذت سے نا آشنا ہیں ، نیند کی حالت میں بھی خوف زدہ رہتے ہیں لیکن خدا تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے ۔ کیا جھوٹ ، تشکیکی چیزیں اور اہانتیں آپ کے ایمان بالغیب کو سلب کرتی ہیں یا اس سے تمہارے ایمان اور اس کی راہ میں مرمٹنے کے جذبہ میں اضافہ ہوتا ہے؟ ہم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بہتر یہ تھا کہ معجزہ ہوتا کہ جس سے عتبات مقدسات کو نقصان نہ پہونچتا اور توپوں کے گولے حضرت عباسؑ کے روضہ تک نہ پہونچتے اور امام رضاؑ کے روضہ میں خدا بم دھماکہ نہ ہونے دیتا۔

میں کہتا ہوں کہ ان مرقدوں پر ہم نے جو تعمیر کی ہے وہ ان میں میں مدفون ذوات سے افضل نہیں ہے اور نیک ومقدس افراد سے افضل نہیں ہے کہ جن کا خون ظلم و زیادتی کے ساتھ بہایا گیا ہے؟

ائمہؑ اہل بیتؑ پر ان کی حیات ہی میں بے پناہ ظلم ہوئے ہیں، زہر سے کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے نیزوں اور تلواروں سے پاکیزہ بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ بعض نے مدت دراز تک قیدخانوں میں کلفتیں برداشت کیں ۔ اگر عتبات کو انہدام سے بچانے کے لئے معجزہ ضروری وواجب ہے تو بہتر یہ تھا کہ ان کی حیات میں انہیں تکلیف وایذا سے بچایا گیا ہوتا اور تلواروں اور نیزوں کو ان کے پاکیزہ ابدان تک نہ جانے دیا گیا ہوتا اور امام حسینؑ اور بنی ہاشم کے جوانوں کے ساتھ جو المیہ پیش آیا ہے اور ان کے باایمان اصحاب عورتوں اور بچوں کو کربلا، کوفہ اور شام میں جو اذیتیں دی گئیں ہیں ان سے بچایا گیا ہوتا۔

محسن اسلام حضرت ابوطالبؑ

جناب اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی (کراچی)

قطعہ

ظاہر کے پس منظر باطن نظر آتے ہیں
احسان شناسوں کو محسن نظر آتے ہیں
آتی ہے نظر سب کو آئینے میں شکل اپنی
مومن کو ابوطالبؑ مومن نظر آتے ہیں

اپنی آغوش میں پالا ہے محبت کی ہے
ہر طرح تربیت نور رسالت کی ہے

جس کو تم کہتے ہو کافر اس ابوطالبؑ نے
عقد میں بھی تو محمدؐ کی وکالت کی ہے

آل عمران رہی وارثِ میراثِ خلیل
اس نے ہر دور میں کعبے کی حفاظت کی ہے

در و دیوار کی تعمیر میں حصہ لے کر
علم کا شہر سجایا ہے سکونت کی ہے

قبل بعثت ہو کہ ہو بعد ظہور اسلام
جان پر کھیل کے اسلام کی نصرت کی ہے

عمر کاٹی ہے پیمبرؐ کا محافظ بن کر
اہل اسلام کی بے خوف قیادت کی ہے

لے کے کنبے کو رہے شعب ابوطالب میں
کب کسی اور نے اس طرح اعانت کی ہے

بے اثر ترک موالات کا میثاق کیا
اک یہ ادنیٰ سی جھلک فہم و فراست کی ہے

ان کے ہوتے ہوئے کفار کا کچھ بس نہ چلا
نہ رہے سر پہ تو سرکارؐ نے ہجرت کی ہے

اس پہ بہتان طرازی ہے نبیؐ کی توہین
جس کی خود بانئ اسلام نے عزت کی ہے

کفر ہے اس کے لیے کفر کا فتویٰ جس نے
زد پہ تلواروں کی تصدیق رسالت کی ہے

دین کے نام پہ دنیا کے پرستاروں نے
صاف ظاہر ہے جو اسلام کی حالت کی ہے

کیا کوئی اور بھی ہے ان کے گھرانے کے سوا
دین کی جس نے مدد وقت ضرورت کی ہے

ہم نے دیکھا ہے کہ بے موت مرے ہیں دشمن
خودکشی کی ہے اگر ان سے بغاوت کی ہے

نور ایماں سے منور ہیں یہ نظریں ساحرؔ
روشنی دل میں جو ہے شمع عقیدت کی ہے

قصیدہ در مدح

امیر المومنین امام المتقین حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام

حسان الہند مولانا سید کامل حسین نقوی کامل جائسی

پئے زخم جگر کافی نہ نکلی نوک نشتر تک
تبسم میں چھپائی جا رہی ہے صبح محشر تک

تبسم زار بن جاتی ہیں جب آنکھیں تصور میں
مرے آنسو بنا دیتے ہیں اکثر سلک گوہر تک

ہماری ڈبڈبائی آنکھ کے پردے میں وہ کچھ ہے
کہ دامن کھینچ کر ہٹ ہٹ گئے پیچھے سمندر تک

مری عرض تمنا میں ابھی ایسے بھی پہلو ہیں
کہ جن سے پیچ وخم میں پڑ گئی زلف معنبر تک

لکھوں میں حال دل یہ اضطراب دل جو لکھنے دے
مری تحریر خط میں کج ہوئے جاتے ہیں مسطر تک

نہ رویا کوئی دو آنسو مرے زخم تمنا پر
نہ اوڑھی میرے گلشن نے کبھی شبنم کی چادر تک

نکالے کوئی خار آرزو کس کو سلیقہ ہے
مرے زخم جگر میں جذب ہو جاتے ہیں نشتر تک

بنی ہے حلقۂ زنجیر بو خاک شہیداں کی
ہماری خاک پر کچھ دیر رک جاتی ہے صرصر تک

نوید طالع اقبال میں نے بھی سنی اے دل
کہ خون نامرادی سے لکھے جاتے ہیں محضر تک

مری چشم تصور میں خدا رکھے وہ جلوے ہیں
کہ جن کی روشنی میں کھو گئی ہے صبح محشر تک

جدار پاک کعبہ تک پناہ درد لے آئی
میں دل پکڑے ہوئے پہنچا قسیم حوض کوثر تک

اسی در سے زمانے کو ستم کی داد ملتی ہے
تصور کھینچ لایا قاضی باز و کبوتر تک

مرا ٹوٹا ہوا دل جوڑ دینا کیا قیامت ہے
یہ وہ در ہے جہاں بن بن گئے پھوٹے مقدر تک

جلی شمع حرم روشن ہوا اللہ کا گھر تک
یہی وہ روشنی ہے جو ملے گی صبح محشر تک

بلندی تیری ڈیوڑھی کی سوا ہے بام سدرہ سے
حد سیر ملک بھی ختم دیکھی ہے تر در تک

تری نان جویں کا اک ثمر گلدستۂ جنت
تری ''کد یمیں'' کا اک عرق ہے حوض کوثر تک

حریم کعبہ سے لے کر غدیر خم کے منبر تک
سبیلیں تیری مدحت کی ملیں گی حوض کوثر تک

تجسس کی نگاہوں سے ازل میں بھی بہت ڈھونڈھا
نگاہیں جب اٹھیں رک رک گئیں مولائے قنبر تک

بلندی قامت مرسل کی عالم پر ہویدا ہے — جہاں تیرے قدم پہنچے وہاں پہنچے نہیں سر تک
حد قامت کہیں محدود نکلی باب خیبر تک — وہ گذری ہے کہ اب اٹھتے نہیں جبریل کے پر تک
زمیں پلٹی کہ پلٹا شمس لیکن یہ سمجھتا ہوں — ترے ادنیٰ سے جھٹکے بھی بدل دیتے ہیں محور تک
تہی دست ولا میں ہوں تری مولا وہ طاقت ہے — اگر چاہے تو گل ہو آتش دوزخ کا مجمر تک
درون پردۂ اسرار کی باتیں خدا جانے — خط معراج ظاہر میں رہا حیدرؑ سے حیدرؑ تک
بڑے مضبوط ہاتھوں سے ترے دامن کو پکڑا ہے — جہنم نے بہت کھینچا تو کھینچے گا فقط در تک
لباس خلد جس نے پہنے ہوں اس کی غلامی میں — شمیم خلد آئے گی مجھے لینے مرے گھر تک

معراج

قطعات

تذہیب نگروری

عظمت ناتمام ہے معراج
ارتقائے دوام ہے معراج
ہر ترقی کو جس پہ حیرت ہے
اسی نقطہ کا نام ہے معراج

جو نہ عقل و بیان میں آئے
کیسے وہ دو کمان میں آئے
ہے دو حرفی حکایت معراج
آن میں جاکے آن میں آئے

بہر معراج جارہے ہیں رسول
عظمتوں نے جبیں جھکائی ہے
ایک انہونی بات ہوکے رہی
وقت کو آج نیند آئی ہے

مرجع خلائق

شبیب جائسی

بعد کربلا اکثر قید میں ائمہ تھے
پر یہ سوچئے کیونکر قید میں ائمہ تھے
تا کہ ان سے ملنے کا سلسلہ نہ قائم ہو
تشنگان رحمت کا رابطہ نہ قائم ہو
ڈر تھا اہل باطل کو حق نہ جان لے دنیا
اپنا ان کو حاکم بھی کل نہ مان لے دنیا
بس امام کاظمؑ بھی قید اس سبب سے تھے
پر نہ مضطرب مولا ظلم اور غضب سے تھے
مومنین کے سر پر آگئی یہ آفت بھی
خانۂ مظالم میں ہو گئی شہادت بھی
ہاں مگر عدو اب تو روکنے سے قاصر ہے
بوسہ لینے مرقد کا جس کو دیکھو حاضر ہے
بے نشان ہے یارو! دشمن شہ والا
مرجع خلائق ہے مدفن شہ والا

قلم

شاعر آل محمد سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ اجتہادی (کراچی)

میں ساحرؔ ہوں قلم معجز بیاں ہے
کہ یہ معجز نما کا مدح خواں ہے

عصا ہے یہ کلیم طور فن کا
علمدار تخیل کا نشاں ہے

کرن ہے آفتاب منقبت کی
جبھی تو بزم اس سے ضوفشاں ہے

الف ہے ابجد شعر و سخن کا
یہ راہ فن میں میر کارواں ہے

علم ہے تاجداران ہنر کا
شجاعان ادب کا یہ نشاں ہے

یہی ہے لو چراغ معرفت کی
یہی شمع عقیدت کی زباں ہے

یہی کھیتا ہے ناؤ فکر و فن کی
اسی کے دم سے یہ کشتی رواں ہے

اترتا ہے اسی پر طائر فکر
یہ شاخ گل یہ شاخ آشیاں ہے

یہی ہے شمع بزم حال و ماضی
یہی تاریخ عالم کی زباں ہے

جہاد حق میں یہ نیزہ ہے میرا
چلے سوئے عدو تو یہ سناں ہے

تکلم میں زبان علم و حکمت
خموشی میں جواب جاہلاں ہے

یہ جو اک نغمگی ہے اس کے لب پر
یہی تو کعبۂ فن کی اذاں ہے

یہی کاتب ہے قرآن مبیں کا
شرف یہ اس کا دنیا پر عیاں ہے

یہ لکھتا ہے مرا حال محبت
یہ میری لوح دل کا رازداں ہے

کھلے جو دوستوں کی بزم میں تو
زباں اس کی محبت کی زباں ہے

حروف اس کے لئے جام و سبو ہیں
دوات اس کے لئے پیر مغاں ہے

اسی سے لکھ رہا ہوں مدح حیدرؑ
یہی تو میرے جذبوں کی زباں ہے

بہاؤ پر بہے جس طرح کشتی
زمین مدح میں ایسے رواں ہے

ہے لب پر مدح مولود حرم کی
قلم کی بانگ کعبہ کی اذاں ہے

کھنچا جاتا ہے دل سوئے حرم اب
تخیل جانب کعبہ رواں ہے

حرم اور اس کی رونق اللہ اللہ   یہاں تو بزم کوثر کا سماں ہے
نہ کیوں ساقی سے میں بھی لو لگاؤں   میں پیاسا ہوں وہ بحر بیکراں ہے
ہوا پھر مطلع تخئیل روشن   زمین فکر بھی اب آسماں ہے
بڑا پر کیف کعبہ کا سماں ہے   کسی کی آمد آمد اب یہاں ہے
حرم کی سمت وہ بیٹی اسد کی   بحال اضطرار دل رواں ہے
ادھر دیوار ہے باب مقفل   ادھر دیوار میں ایک در عیاں ہے
مبارک ہو کہ اب کعبہ کے اندر   چراغ نور حیدرؑ ضوفشاں ہے
سمندر گر رہا ہے آب جو میں   دہن ان کا محمدؐ کی زباں ہے
چراغ عرش ہے کعبہ میں روشن   کہاں کی جلوہ سامانی کہاں ہے
یہ طالب ہے رضائے کبریا کا   ابوطالبؑ کا یہ آرام جاں ہے
نہ کیوں سجدے کروں باب حرم پر   یہ میر میکدہ کا آستاں ہے
یہ عظمت ماورا ہے ہر گماں سے   علیؑ کی مدح اور میری زباں ہے
میں کیا لکھوں ثنائے شاہ مرداںؑ   قلم میں اس قدر طاقت کہاں ہے
میں ہوں مداح استاد ملائک   مرے منھ میں ملائک کی زباں ہے
جو خالی ہو ثنائے مرتضیٰ سے   وہ لمحہ زندگی کا رائیگاں ہے
اسے دیکھا نہیں لیکن وہ صورت   بصارت پر بصیرت سے عیاں ہے
علیؑ کو پیکر انساں میں بھیجا   خدا انساں پہ کتنا مہرباں ہے
محمدؐ اور علیؑ اس کے مکیں ہیں   یہی تو عظمت کون و مکاں ہے
بقول مصطفیؐ اک ضرب حیدرؑ   دو عالم کی عبادت سے گراں ہے
شب ہجرت خریداری تو دیکھو   عجب بازار ایماں کا سماں ہے
رضائے حق ادھر بکنے پہ مائل   ادھر قیمت میں حاضر نقد جاں ہے
یہ دل جائے کہ سر عشق علیؑ میں   یہاں کس کو غم سود و زیاں ہے

قصیدہ سن کے فرمایا علیؑ نے
یہ میرا ساحرؔ معجز بیاں ہے

نامہ نگار:-اعجاز رضوی جائسی

مقدس مقامات کے تحفظ کے لئے مذہبی رہنما گھیریں گے امریکی سفارت خانہ: مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۲۷/اگست: ایک طرف امریکہ عراق کے کربلا و نجف جیسے مقدس مقامات پر بمباری کر کے نقصان پہنچا رہا ہے اور دوسری طرف ہم لوگوں تک آدھی ادھوری اور جھوٹی خبریں بھی پہنچا رہا ہے جس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ باتیں آج جمعہ کے موقع پر تاریخی آصفی مسجد میں موجود ہزاروں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے شیعہ قائد مولانا کلب جواد نے کہا کہ عراق کے موجودہ حالات بے انتہا خراب اور تشویش ناک ہیں لیکن اس سے زیادہ قابل افسوس بات اس کی صحیح جانکاری ہم لوگوں کو نہ ہو پانا بھی ہے۔ مولانا کلب جواد نے کہا کہ کربلا اور نجف کے مقدس مقامات پر امریکہ کے ذریعہ مسلسل کی جارہی بمباری اور مسجد امام علیؑ میں پناہ لئے ہوئے افراد کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات کو کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا اور اس کے لئے جلد ہی ہندوستان بھر کے ایک کروڑ لوگوں کے دستخط کے ساتھ ایک میمورنڈم نئی دہلی واقع اقوام متحدہ کے حکام کو سونپا جائے گا جس کی مہم شروع ہوچکی ہے لیکن اس سے پہلے ۱/ستمبر کو امریکی سفارت خانہ کے سامنے سبھی مذاہب کے رہنماؤں کے ساتھ احتجاجی مظاہرہ کیا جائے گا جس کے لئے مذہبی رہنماؤں کو دعوت نامے بھیجے جارہے ہیں۔

مولانا کلب جواد نے قوم کے ان نام نہاد رہنماؤں کو آڑے ہاتھوں لیا جو امریکہ کے ہاتھوں کی کٹھپتلی بنے صرف اپنے فائدہ کے لئے قوم کو استعمال کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ اب پہلی ستمبر کو قوم کو صاف پتہ چل جائے گا کہ امریکہ کے ہاتھوں بکے ہوئے رہنما کون ہیں؟ لیکن ہمیں امریکہ نواز ان رہنماؤں کے احتجاج میں نہ پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے پہلی ستمبر کو سفارت خانہ کے سامنے طے شدہ پروگرام ہر حال میں ہوگا چاہے گنتی کے ہی رہنما کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس میں عوام کی شمولیت نہیں ہوگی یہ احتجاج صرف سبھی مذاہب کے رہنماؤں کے ذریعہ کر کے امریکہ سے مانگ کی جائے گی کہ عراق میں کی جارہی بمباری کو فوراً بند کیا جائے اور امریکہ نجف، کربلا اور سامرہ میں واقع مقدس مقامات کی حفاظت کرے کیونکہ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت کا سوال ہے۔ مولانا نے میمورنڈم پر زیادہ سے زیادہ دستخط کرنے کی بھی اپیل کی ہے۔

آج ہر تحریک کی مخالفت عالم کی طرف سے ہوتی ہے: مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۱۰ ستمبر: عراق میں امریکی بمباری اور بربریت کے خلاف دہلی میں علماء کے ذریعہ امریکی سفارت خانہ کو گھیرے جانے کا پروگرام رد ہونے کے باوجود ملک بھر سے ایک کروڑ امن پسند باشندوں کے دستخط شدہ میمورنڈم دینے کا پروگرام آئندہ ۲/اکتوبر کو ہر حال میں ہوگا جس کی تیاری یہاں زور و شور سے چل رہی ہیں۔ شیعہ قائد مولانا کلب جواد نے آج جمعہ کے موقع پر تاریخی آصفی مسجد میں موجود ہزاروں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ ۲/اکتوبر کو امن کے پجاری مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش ہے جو ظلم پر یقین نہیں کرتے تھے اس لئے عراق میں امریکہ کے ذریعہ جاری ظلم کا جواب ہندوستان کے ایک کروڑ امن پسند شہری گاندھی جی کے یوم پیدائش پر دہلی میں اقوام متحدہ کے حکام کو میمورنڈم سونپ کردیں گے جس میں مانگ کی جائے گی کہ عراق سے فوراً امریکی فوجوں کو ہٹا کر وہاں کے عوام کے ذریعہ چنی گئی سرکار کو حکومت کا نظام سونپا جائے۔ مولانا نے عراق میں عالم اسلام کے عظیم رہنما آقای سیستانی کی کوششوں سے عراق کے حالات میں آنے والی تبدیلی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کو پتا چل جانا چاہئے کہ مراجع کی مذہب میں کیا حیثیت ہوتی ہے ان کی بات میں کتنا دم اور اثر ہوتا ہے جن کے ذریعہ تمام مشکلات کو حل ہی نہیں بلکہ بڑوں کا تختہ بھی پلٹا جاسکتا ہے۔

مولانا کلب جواد نے شیعہ کالج کے قیام کے سلسلے میں پچھلے کچھ دنوں سے جاری جھوٹی بیان بازی اور پمفلٹ تقسیم کئے جانے پر گہری ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ کالج کے بانی قدوۃ العلماء مولانا آقا حسن صاحب مرحوم تھے اور انہیں کی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجے میں شیعہ کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس بات سے انکار کرنے والے چند نام نہاد مولوی اپنی ہٹ دھرمی کے چلتے اس بات سے اسی طرح انکار کررہے ہیں جیسے کوئی چاند اور سورج کے وجود سے انکار کرے۔ مولانا نے کہا کہ یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے لگ بھگ سبھی علماء کی پوری حمایت انہیں حاصل تھی جبکہ آج یہ حال ہے کہ ہر تحریک کی مخالفت عالم ہی کی طرف سے اس طرح کی جاتی ہے جیسے یہ ان کا دینی و اسلامی فریضہ ہو۔

مولانا کلب صادق صاحب کے بیان کو سیاسی رنگ دینے کی مذمت: کلب جواد صاحب

لکھنؤ ۱۷ ستمبر: شرعی اور سماجی مسئلوں کو سیاسی مسئلہ بنا دینے میں ماہر لوگ مولانا کلب صادق کے بیان کو بلاوجہ طول دے رہے ہیں۔ آج جمعہ کے موقع پر شیعہ قائد مولانا کلب جواد نے تاریخی آصفی مسجد میں موجود ہزاروں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر مولانا ڈاکٹر کلب صادق کی پچھلے دنوں مسلمانوں کے لیے فیملی پلاننگ اپنانے کی صلاح کا غلط مطلب نکالا جا رہا ہے۔ جب کہ اس سلسلہ میں قرآن واحادیث کی روشنی میں عورت یا مرد کو مکمل طور سے بانجھ بنانے والا طریقہ اپنانا تو غلط ہے لیکن عارضی طور سے اپنے خاندان کو مختصر رکھنے کے لیے وہ تمام طریقے جائز ہیں جو آج چلن میں ہیں۔ اس کے لیے کوئی شرعی یا دینی ممانعت ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ آج یہ ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولادوں کو بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت سے آراستہ کر کے نیک شہری بنائے۔

مولانا کلب جواد نے کہا کہ آج حالات کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو بہتر تعلیم اور قابلیت کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ حکومت کثرت سے نہیں قابلیت سے کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ جیسے طاقتور ملک میں رہنے والا ۳ فیصد یہودی اپنی قابلیت کی بنا پر ہی وہاں کی حکومت پر قابض ہے اکثریت کی بنا پر نہیں۔ اسی طرح سے مسلمانوں نے ہندوستان جیسے وسیع ملک پر اپنی مختصر تعداد کے باوجود سیکڑوں برس حکمرانی اپنے علم وذہانت اور دین و دیانت کی بنیاد پر ہی کی تھی۔

مجلس سید الشہداءؑ بتاریخ وفات غفرانمآبؒ

لکھنؤ ۶ ستمبر: مذہب اثنا عشری کو ہندوستان میں رواج دینے والے برصغیر کے عظیم مصلح مجدد الشریعت، محی الملت، ماحی بدعت، قاطع صوفیت و اخباریت، بحر العلوم آیۃ اللہ العظمیٰ السید دلدار علی النقوی المعروف بہ غفران مآبؒ طاب ثراہ کے دیسے کی مجلس جناب کے عزاخانے میں ۱۹ رجب ۱۴۲۵ھ ۵ ستمبر ۲۰۰۴ء بروز یکشنبہ (اتوار) منعقد ہوئی جس میں مولانا سید ابن حیدر صاحب قبلہ نے ایک بڑے مجمع کو خطاب فرمایا۔

اس موقع پر اسیفؔ جائسی کی تحریک پر جناب جمیل شمسی صاحب نے ایک عالیشان گیٹ کلب حسین مارگ کے دہانے پر لگوایا جس پر حضرت غفران مآبؒ اور ان کے فرزند اکبر حضرت رضوان مآبؒ کی یادگار تصویریں بھی آویزاں تھیں۔

عظیم الشان سیمینار

لکھنؤ ۱۳ ستمبر: رہبر انسانیت، مبلغ حقانیت، حکیم اسلام، کاسر اصنام واوہام، امیر المومنین، امام المتقین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی تقریب کے موقع پر ایک سیمینار بعنوان ''انسانی حقوق زندگانی حضرت علیؑ کی روشنی میں''، معین الشریعہ مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب قبلہ امام جمعہ لکھنؤ کی جانب سے باہمکاری خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، بتاریخ ۱۲ ستمبر ۲۰۰۴ء بروز یکشنبہ (اتوار) بمقام گولڈن پیلس اکبری گیٹ چوراہا لکھنؤ منعقد ہوا۔ یہ اجلاس دونشستوں پر مشتمل رہا۔ پہلے کا افتتاح عالی جناب جلال تملے مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران دہلی نے کیا۔ سیمینار کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اس کے بعد علماء اور دانشمندوں نے اپنے بیانات سے سامعین کو محظوظ کیا اور دوسرے اجلاس میں مقالات کے ذریعہ دانشوروں نے حضرت علیؑ کے خدمات واحسانات کا اپنے اپنے انداز میں اعتراف کیا۔ دونوں اجلاسوں میں مرکزی فکر یہی رہی کہ کس طرح حضرت علیؑ نے حقوق انسانی کا تحفظ کر کے ساری دنیا کو انسانی حقوق کے تحفظ کا درس دیا۔

ہر دو اجلاس کے بحیثیت مقرر ومقالہ نگار شرکاء میں مفکر اسلام مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب قبلہ، جناب خان محمد عاطف صاحب صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، جناب خلیل اظہر اشرفی صاحب چیئرمین عربی وفارسی بورڈ، جناب احسن الظفر صاحب ریڈر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر جناب فضل امام صاحب، پروفیسر مہدی حسن صاحب، مولانا فرمان علی صاحب چیئرمین شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیوسٹی، جناب جلال تملے صاحب کے نام خاص ہیں۔

آخر میں معین الشریعہ مدظلہٗ نے اپنے ایمان افروز بیان سے سامعین کو استفادہ کا موقع مرحمت فرمایا۔ سیمینار میں دیگر مسالک ومذاہب کے افراد کی شرکت خاندان اجتہاد کی اتحاد پسندی کی طرف دوسرے اذہان کو بھی متوجہ وآمادہ کر رہی تھی۔